اس بازار میں

شورش کاشمیری

اُس بازار میں

شورش کاشمیری

مکتبہ چٹان ۸۸ میکلوڈ روڈ، لاہور

جملہ حقوق اشاعت وطباعت محفوظ ہیں

بحق مطبوعات چٹان لاہور

اشاعت جدید ---------- گیارہ سو

مطبع ---------- چٹان پرنٹنگ پریس لاہور

ناشر ---------- مطبوعات چٹان لاہور

قیمت ---------- [redacted]

7150

آہ ـــــ میرے پاس طاقت ہوتی تو اس کتاب کو نہ لکھتا اُس معاشرہ کے در و دیوار ہلا ڈالتا جس میں عورت کبی ہے ، میرے پاس تلوار ہوتی تو سیاسی کھوپڑیوں کی فصل کاٹتا کہ پک چکی ہے ، میرے پاس صرف قلم ہے ، اور میں نے اس عورت کے زخم پیش کئے ہیں ، جن کا روپ عیاش انسانوں کے قہقہوں کی دستبرد میں ہے۔

کاش ـــــ مجھے اختیار ہوتا کہ میں بڑے بڑے عماموں کے پیچ کھولتا ، ان کی دستارِ فضیلت کے پھریرے بنا کر بالاخانوں پہ لہراتا عالمگیری مسجد کے دروازے پر کھڑا ہو کر فقیہِ شہر کو للکارتا ، اس کی دراز قبا پھاڑ ڈالتا اور اس کے ٹکڑے دریدہ عفتوں کے حوالے کرتا کہ اپنی برہنگی ڈھانپ لیں۔

قبا نہیں ، اورنگ زیب کی بیٹی زیب النسا کا کفن ہے۔

کوئی شخص اس کے مطالعہ سے گمراہ ہوتا ہے تو
میں سمجھوں گا کہ اس نے میری کتاب کا مقصد کھو
دیا ہے، کوئی راہ پر آتا ہے تو مجھے خوشی ہوگی کہ
اس کے نفس کی نیکی جاگ اٹھی ہے، اس کے علاوہ نہ مجھے
داد و تحسین کی ضرورت ہے کہ اس جنس کاسد سے میرا
جی بھر چکا ہے، نہ فقیہوں کی ملامت معلموں کے قہر،
اور راہنماؤں کی خشونت سے ڈرتا ہوں کہ اس کرۂ ارض
پر ان سے زیادہ بے مایہ چیز کوئی نہیں ہے۔

گذارش

زیرِ نظر کتاب کی اشاعت بیس سال پہلے روک دی تھی کہ بعض وجوہ کے باعث میں نے یہی فیصلہ کیا تھا، لیکن میرے قلم کے حریفوں نے جو صحافت و سیاست میں ابھی نومولود ہیں، اس کتاب کو میرے لئے طعن بنا لیا اور میں اُن کے اخلاق کی پستیوں پہ ہنستا رہا۔ بعض مخلص دوستوں نے مشورہ دیا کہ اس کی اشاعت میں ہرج کیا ہے۔ چند سے غور کیا، پھر طباعت کا فیصلہ کر لیا۔ کتاب میں کوئی حک و اضافہ نہیں کیا۔ جس طرح تھی اُسی طرح حاضر ہے۔ بعض املا کی غلطیاں درست کی ہیں یا فقروں میں سے الفاظ کی جھول نکال دی ہے۔ البتہ بعض تصویریں بدل دی ہیں۔ پہلی تصویریں اور ان کے بلاک گم ہو چکے تھے، ان کی جگہ بعض دوسری تصویریں لیکر آفسٹ پرنٹنگ کی ہے، لیکن کتاب کے ابتدائی پہرے موجود ہیں۔ ان کی تصویریں شامل ہیں۔

مولف نے عنفوانِ شباب میں "اُس بازار" کا سفر کیا۔ بحمد اللہ، نفس آلودہ ہونے سے بچا رہا۔ اس اعتبار سے حشر کے دن رحمۃ العالمین کے صدقہ میں شرمندگی

نہ ہوگی۔ لیکن اُن کی رحمۃ العالمینی کے سوا شفاعت کا اور کوئی وسیلہ بھی نہیں۔ احقر کو اپنے گناہگار ہونے کا اقرار ہے۔

مولف کے خلاف اس کتاب کی بنا پر قلم کے قلندروں، زبان کے لُقّوں، سیاست کے اوباشوں اور صحافت کے حرافوں نے خوفِ خدا کو آگ لگا کر سب کچھ کہا۔ ژاژخائی کے انبار لگا دیئے۔ اب فیصلہ حشر کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضور رحمۃ اللعالمین کے روبرو ہوگا۔ اُن کا دامن میرا ہاتھ ہوگا۔ عدلِ الٰہی کی ترازو میں ہر چیز تُل جائے گی۔

مولف اپنے نفس کی سچائی کا اعلان کرتا ہے بفضل تعالیٰ کوئی وجود کسی رعایت سے اُس کے خلاف مستغیث نہیں ہوگا ؎

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

شورش کاشمیری

ردِّ عمل

یہ کون ناچ رہی ہے بلند کوٹھے پر
فضا میں تیر رہا ہے سرودِ چنگ و رباب
ہوا کے دوش پہ ہے گھنگھروں کی موسیقی
غزل کی لے میں گھلے جا رہے ہیں شیب و شباب
اُڑاؤ راگ کہ ہے محتسب بھی رندِ خراب
اُٹھاؤ جام مداوائے روزگار ہے یہ
قبائیں کھول دو، زُلفوں کو مُنتشر کر دو
بڑھاؤ ہاتھ، تقاضائے نوبہار ہے یہ
مُغنّیہ کی دُھنیں ہیں کہ کہکشاں کے خُطُوط
یہ پھول وہ ہیں کہ شرمندۂ بہار نہیں

ہر ایک بول ہے دامن کشِ شکیب و قرار
شراب لاؤ کہ ہستی کا اعتبار نہیں
بنا رہی ہے کئی زاویے فضاؤں میں
نرت کے رُوپ میں تبدیل ہوتی جاتی ہے
گُداز جسم کی ہر قوس ایک نغمہ ہے
ہوا سرود میں تحلیل ہوتی جاتی ہے

صدائے منبر و محراب؟ اسے خدا کی پناہ
کہ اس سے نغمۂ چنگ و رباب بہتر ہے
حرم فروش فقیہوں کے حوضِ کوثر سے
مُغنّیہ کے لبوں کی شراب بہتر ہے

بھکارن

ارے تو کون ہے؟ کیا ڈھونڈتی پھرتی ہے راہوں میں
فقیرِ رہ نشیں ہے؟ یہ ترا کشکول خالی ہے
"خُدا کے واسطے" کی چوٹ ہے لب ہائے نازک پر
اِدھر بھرپور جیبیں ہیں اُدھر دستِ سوالی ہے

ٹھہر چشمِ تماشا! دیکھ اس حوّا کی بیٹی کو!
کہ اس کے حال پر لیے درد راہی مسکراتے ہیں
لرزتے آنسوؤں کا سُرمئی آنکھوں میں پانی ہے
گھنی پلکوں میں ناگفتہ فسانے تلملاتے ہیں

تراشا ہے اسے بھی صانعِ قدرت کے ہاتھوں نے
اسے بھی دو دلوں کی باہمی اُلفت نے ڈھالا ہے
کوئی تو اس چراغِ رہ گذر کا بھی حبدا ہوگا
اسے بھی غالباً ماں باپ کی شفقت نے پالا ہے

عجب کیا ہے، فلاں ابنِ فلاں کی مہربانی سے
گدائی مرحلوں کے بعد "اُس بازار" میں پہنچے
بہ ایں حالِ زبوں عصمت کی تابانی گنوا بیٹھے
غریبی بیچ دے اور پہلوئے زردار میں پہنچے

خدا کے نام پر بازار میں کوڑی نہیں ملتی
ہوس کی چاشنی سے دل کا کاروبار چلتا ہے
گُلابی ہونٹ اک جنسِ گرانمایہ ہیں منڈی میں
انھیں اجسام سے یہ حُسن کا بازار چلتا ہے

○

مسجدِ ویلنار

سوچتا ہے ذہن شاعرِ وقت کی تحریر پر
خواب کی مُہریں ہیں حیرت خانۂ تصویر پر
ناکشُودہ ہیں ابھی تک عقدہ ہائے مرگ و زیست
عقلِ انساں دنگ ہے نیرنگیٔ تقدیر پر
چیستاں ہیں روز و شب کے حلقہ ہائے نَو بنَو
گنگ ہے فطرت کتابِ دہر کی تفسیر پر

ہے طلوعِ شمس کے پردے میں شب کا آب و رنگ
مشعلِ تخریب کا پرتو ہے ہر تعمیر پہ
زندگی فطرت کے ہاتھوں میں شکستہ ساز ہے
موت کے سنسان ویرانے میں اک آواز ہے
مسجدِ شاہی کے میناروں کی رفعت کا شکوہ
مہبطِ انوارِ یزداں ہے سراپا نور ہے
اس کی دیواروں پہ کندہ ہے سپاسِ ذوالجلال
اس کے بام و در پہ نور افشاں چراغِ طور ہے
لیکن اس سے دس قدم پر جاگتی راتوں کا شہر
عارض و گیسو کی صنعت کیلئے مشہور ہے
بادۂ لعلیں سے ہے بریز جامِ زر نگار
ہر کہ و مہ نشۂ حرص و ہوا میں چور ہے
عورتیں نیلام کرتی ہیں بکثرت عصمتیں
حسن خود اپنے لیے رستا ہوا ناسور ہے
ٹوٹتی ہیں رات کی نبضیں اذاں کی ضرب سے
پائلوں کی چھن چھنا چھن سے فضا معمور ہے

اس فضا کا ذرّہ ذرّہ معصیت بردوش ہے
آدمی محسوس کرتا ہے ، خدا خاموش ہے
روز و شب حوّا کی بیٹی کی حیا نیلام ہو؟
ہم جمالانِ زلیخا کی وفا نیلام ہو؟
عارضِ گلگوں پہ ہو تضحیک کا گرد و غبار
لالہ و گُل کے لبادے میں حیا نیلام ہو؟
اک طرف زہرہ بدن انگڑائیاں لے کر اٹھیں
اک طرف صوفی و مُلّا کی قبا نیلام ہو
زاویے بنتی رہے رقاصۂ زہرہ جبیں
غنچہ ہائے نَو شگفتہ کی صدا نیلام ہو؟
اس طرف ہو مسجدِ شاہی میں بانگِ "لاتخف"
اس طرف بازار میں خوفِ خدا نیلام ہو؟
اشہبِ تاریخ کو حاجت ہے پھر مہمیز کی
بُزدلوں کو پھر ضرورت ہے کسی چنگیز کی

○

اُس بازار میں

بکھرے بکھرے تاش کے پتّے چند جواری کھیل رہے ہیں
فکر میں ہر اک ڈوب رہا ہے، باری باری کھیل رہے ہیں
حُکم کی دُگی، اینٹ کا دہلا، چشمِ زدن میں جیت گئی ہے
سکوں کی جھنکار کے بل پر رات اندھیری بیت گئی ہے
خواجہ کی دستار کا سلمہ اَیرے غَیرے لُوٹ رہے ہیں
کلیوں کے منہ زرد پڑے ہیں سرو کے پرچم ٹوٹ رہے ہیں
داؤں پہ ہے ہر ایک کھلاڑی ترساں ترساں لرزاں لرزاں
جیتنے والے خنداں خنداں، ہارنے والے حیراں حیراں

یہ مارا وہ پانسہ پلٹا، یہ جیتے وہ ہار رہے ہیں،
حکم اور اینٹ کی ترپ نہیں ہے پھول کے پتے مارے ہیں
جیتو ہارو، ہارو جیتو، اس ڈیرے کی ریت یہی ہے
اس سے چھینو، اس پر جھپٹو، میت کے بھوکو میت یہی ہے
دھوپ چڑھی آتی ہے سروں پر کھیلنے والے لوٹ چکے ہیں
سُرخ ہیں اب سونے کی چٹانیں خون کے چشمے پھوٹ چکے ہیں

○

خرید و فروخت

رات اس بازار میں اک حور وش کی سیج پر　　اک فقیہہِ شہر کی ریشِ حنائی بِک گئی
دھن دھنا دھن کی صدا میں کھو گیا احساسِ زہد　　منبر و محراب کی شعلہ نوائی بِک گئی
بِک گئی بِکنے کی شے تھی پارسائی بِک گئی

○

ریشم میں ٹاٹ کا پیوند

بسترِ سنجاب پر چودہ برس کی بیسوا　　اک بہتّر سال کے بڈھے سے ہم آغوش ہے
کہکشانی جسم بِکتے ہیں بھرے بازار میں　　بالاخانوں کی بلندی معصیت بر دوش ہے
اور — اس طُرفہ تماشے پر خدا خاموش ہے

○

ایک تعارف

(عبدالمجید سالکؔ)

عورت کی جسم فروشی دُنیا کا قدیم ترین پیشہ ہے۔ اس کرۂ ارضی پر سب سے پہلی جنس جو بیچی گئی اور خریدی گئی یہی جنس ہے۔

ابتدائے آفرینش کے پہلے مردوں میں سے کسی نے عورت سے متمتع ہونے کے لیے کسی پھل یا پھول یا کسی اور ذائقہ فریب یا دیدہ زیب چیز سے عورت کو لُبھایا ہوگا۔ اور عورت نے اس چیز کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا ہوگا۔ بس یہیں سے جسم فروشی کی بنیاد پڑی۔ یعنی حرص اور احتیاج نے اس پیشے کو جنم دیا۔ اس چیز نے آگے چل کر ازدواج اور اُس کی

مختلف صُورتوں میں ارتقا کی منزلیں طے کیں لیکن یہ بحث میرے موضوع سے خارج ہے۔

ابتدائی مذاہب سے جنس کا تعلق ایک تاریخی حقیقت ہے کیونکہ مذہب اور جنس دونوں جذبات ہی کی تسکین کا ذریعہ ہیں۔ یونان کے ایپکیورس، بھارت کے بلبھ سوامی اور دام مارگی فرقے کے لوگوں نے استلذاذِ جنسی ہی کو شکرِ نعمت اور عبادت قرار دیا اور جب مذہب میں تصوف کا عنصر شامل ہوا تو اس کا تعلق "جنس" کے ساتھ اور بھی واضح ہو گیا اور "ہمہ اوست" کے پردے میں خدا جانے جنس کی کیا کیا صورتیں جواز حاصل کر گئیں۔ اسلام نے دیوداسیوں کا ادارہ تو پیدا نہ ہونے دیا لیکن حضرت داتا گنج بخشؒ۔ حضرت معین الدین اجمیریؒ۔ حضرت صابر کلیریؒ۔ شاہ بری لطیفؒ اور دوسرے صُوفیا کے مزاروں پر طوائفوں کا رقص و سرود اسلام کے اخلاقِ عالیہ کے باوجود اب تک جاری ہے۔

اسلام نے جنس کے متعلق نہایت دانشمندانہ رویّہ اختیار کیا اس نے تقاضائے جنسی کی فطری حیثیت کو تسلیم کیا۔ تعدّدِ ازواج کی اجازت دی۔ لونڈیوں سے تمتع کی گنجائش بھی پیدا کی۔ طلاق کو بھی آسان کر دیا اِن تمام رخصتوں اور اجازتوں کے بعد زنا کی سزا کی سختی طبعی و قدرتی تھی۔ اسلام طوائفیت کا سخت دشمن ہے وہ مانتا ہے کہ یہ فتنہ احتیاج سے پیدا ہوتا ہے چنانچہ اس نے زیادہ سے زیادہ عورتوں

کو شرفا کے گھروں کی چھت کے نیچے پناہ دینے کا انتظام کر دیا تاکہ کوئی عورت معاشی احتیاج سے مجبور ہو کر عصمت فروشی اختیار نہ کرے۔

طوائفیت انسان کے زمانہ جاہلیت کا ادارہ ہے جیسے شراب قدیم ایام سے چلی آتی ہے۔ اسلام نے دونوں کو ناجائز قرار دیا لیکن جس طرح شراب اس کے باوجود اب تک پی جاتی ہے اسی طرح طوائفیت بھی جاری ہے۔ تاہم ان امور میں اسلام کی سعیٔ اصلاح کے نتائج نظرانداز نہیں کئے جا سکتے تاریخِ اسلام کے جن سلاطین و اُمرا نے ان عیبوں کی حوصلہ افزائی کی ان کے افعال کی ذمہ داری اسلام پر نہیں بلکہ جاہلیت پر ہے۔

شورش کی یہ کتاب بہت سے حلقوں کو چونکا دینے والی ثابت ہوگی مذہبی رجحان کے لوگ اس پر یونہی ناک بھوں چڑھائیں گے۔ جیسے ہر حقیقت کے اظہار پر ان کی عادت ہے۔ اخلاق کے علم بردار کہیں گے کہ اس کتاب کا اثر اخلاقِ عامہ پر اچھا نہ ہوگا گو ان کے اس دعوے کی دلیل کوئی نہ ہوگی۔ اربابِ حکومت ان انکشافات کو اپنی بے تدبیری بے حسی یا بے بسی پر حملہ سمجھیں گے۔ لیکن اہلِ فکر اس کتاب کو پڑھ کر سوچ میں پڑ جائیں گے کہ آخر طوائف کے ادارے کو کیا کیا جائے اسے باقی رکھا جائے تو کیا حدود و قائم کی جائیں کہ جواز اور افادے کی صورت نکل آئے اور اگر اسے موقوف کیا جائے تو کیونکہ؟ اور اس موقوفی کے نتائج کا مداوا کیا ہو؟

عمرانیات کے طالب علم رائے زنی کریں گے کہ اس ادارے کا وجود کیوں ہے اور کون سے معاشی و عمرانی عوامل کو بروئے کار لانے سے یہ ادارہ نابود کیا جا سکتا ہے؟

شورش نے اپنے قول کے مطابق "چھ سولہ کیوں" کے حالات معلوم کر کے جو تجزیہ کیا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادارہ ہمارے معاشرے کے لیے لعنت ہے۔ لیکن یہ لعنت بھی معاشرے ہی کی خرابیوں کی شرمندۂ احسان ہے ـــــ خدا کرے داناؤں کا یہ قول غلط ہو کہ "خود کردہ را علاجے نیست"؛ ورنہ معاشرے کو یہ گھن آہستہ آہستہ ختم کر دے گا ـــــ شورش کے نزدیک غربت، بیوفائی، معاشرتی خرابی، فحش ادب، آزادہ روی، شوقِ تفریح وغیرہ اس ادارے کے قیام کے اسباب ہیں۔ لیکن اصل مرکزی نقطہ یہی ہے کہ ہمارے نظامِ حیات کی اقتصادی اور معاشرتی چولیں بالکل ڈھیلی ہو چکی ہیں۔ جب تک یہ نظام نہ بدلے گا عصمت فروشی بند نہ ہو گی۔ اللہ اور رسولؐ کے احکام بہت سُنائے جا چکے، اخلاق کے وعظ بہت ہو چکے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اور بعض اہلِ فکر کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ اسلام بھی اپنی تعلیمِ اخلاق میں محض اسی لیے کامیاب ہوا تھا کہ اس نے معاشرے کو اقتصادی اور معاشرتی نابرابری سے پاک کر دیا تھا۔ اس کے بعد اسلام نے منہیات پر جتنی زجر و توبیخ اور تخویف و ترہیب روا رکھی اس کا مخاطب وہی پاک شدہ نظامِ معاشرت تھا۔ معاشرے کو انتہائی ثروت اور انتہائی ناداری میں تقسیم کر دینا اور ہر طرف

آزادگی و اباحت کی فضا پیدا کر دینا اور اس کے بعد توقع رکھنا کہ لوگ احکام اسلامی کی تعمیل میں منہیات سے مجتنب رہیں گے بہت بڑی زبردستی ہے۔!

شورش نے اس کتاب کے پہلے اور دوسرے باب میں عصمت فروشی اور طوائفیت اور جنس پرستی کی جو تاریخ بیان کی ہے اس سے ہر شخص اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ اس ادارے کو ابتدائی زمانوں میں مذہب کی اور بعد کے ادوار میں سلاطین و امرا۔ کی سرپرستی حاصل رہی۔ اور انہی کی فحش نوازیوں نے اس کو دوام بخشا —— آج بھی بالکل یہی کیفیت ہے —— تصوف کی بعض محفلوں میں "شیخ مجلس" مجرا کرنے والی طوائفوں کو عطیات سے نوازتے ہیں اور سرمایہ داروں کی دولت تو شب و روز ہی ان پر نچھاور ہوتی ہے۔

پھر ٹبی اور بازار شیخوپوریاں اور ہیرامنڈی کے متعلق تفصیلات اپنا ماجرا خود ہی بیان کر رہی ہیں کسی تعارف و تشریح کی ضرورت نہیں۔

طوائفوں کا ایک بیان تو یہ ہے کہ ان کا مذہب پیسہ ہے اور دوسرا یہ کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ مزاروں پر چڑھاوے چڑھاتی ہیں۔ پیروں کی نذر نیاز دیتی ہیں۔ یعنی طوائف آج تک اس حقیقت کا اعتراف کر رہی ہے کہ اس کے سر پر سرمایہ اور مذہب دونوں کا چترِ عاطفت سایہ فگن ہے۔

شورؔش کے دلفریب اندازِ تحریر کی سجاوٹیں اور شوخیاں اس وقت درجۂ کمال کو پہنچتی ہیں جب وہ کلیائیوں کی داستان سے نکل کر ڈیرے دارنیوں کے تذکرۂ جمیل کی طرف عنان تاب ہوتا ہے۔ لیکن خورشید اور نیلم کے بیانات میں جو فطریت اور حقیقت ہے، جو سادگی اور سلاست ہے، جو خلوص اور صداقت ہے وہ ڈیرے دارنیوں کے ذکر و فکر میں مفقود ہے۔ صرف شمشاد۔ امتیاز۔ ممتاز اور شہناز ہی کو مصنف نے طبّاعی، تفلسف، ادب اور تفنّن کے پیکرہائے حسین میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ڈیرے دارنیوں کی صحبت کے طفیل سے محمد دین تانگے والا۔ حمزی طبلے والا، مائی وزیر بلکہ شوکت ہیجڑا تک حقائقِ حیات کا وہ علم اور ان کے اظہار کا وہ ملکہ رکھتے ہیں کہ ہمارے بڑے بڑے فلسفیوں اور ادیبوں کو نہیں ——— پھر مختار نے تو علم موسیقی کے متعلق معلومات کے وہ دریا بہائے ہیں کہ مختار تو مختار آغا حشؔر کو بھی میسّر نہ ہوں گے۔

خدا جانے یہ مصنف کے کمالِ انشا اور مہارت تحریر کا کرشمہ ہے یا آج کل ٹبّی سچ مچ ہی غرناطہ و بغداد کی جانشین بن رہی ہے کہ اس میں ایسے ایسے حکیم۔ کلیم۔ ادیب اور مُغنّی جمع ہو رہے ہیں۔

ممتاز بہت ہی ذہین و طبّاع لڑکی سہی لیکن شورؔش کی قلم کاری نے اسے بلندیوں تک پہنچا دیا ہے —— اور شہناز کتنی ہی عالم فریب بہ قاصہ

سہی لیکن ذرا شورش کے قلم سے "ادبیت کا اسراف" ملاحظہ ہو۔ ،

"اس کا ناچ تیز ہوتا گیا۔ اس کی دھنیں پھیلتی گئیں۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہوتا گیا۔ اس کی ادائیں نکھرتی گئیں۔ اس کے پھول کھلتے گئے۔ اس کے شعلے ٹوٹتے گئے۔ اس کا روپ سوا ہوتا گیا۔ اس کی جوانی کا الاؤ بھڑکتا گیا۔ کبھی لہروں کی طرح بڑھی کبھی پنکھڑیوں کی طرح سمٹی۔ کبھی خوشبو کی طرح پھیلی۔ کبھی بجلی کی طرح کوندی۔ کبھی مینا کی طرح چھلکی، کبھی ساغر کی طرح کھنکی، کبھی گلاب کی طرح مہکی کبھی بلبل کی طرح چہکی، کبھی گھٹاؤں کی طرح اٹھی، کبھی میکدے کو نکل گئی۔ کبھی بتکدے کو آ گئی کبھی آغوش بن گئی کبھی رنگوں کا پیکر بن گئی۔ لیکن جیسے جیسے وہ ناچتی گئی، اس کا ہر زاویہ سوال بنتا گیا فرشتوں کا زہر خند — قدرت کا نوحہ —— "

میرے نزدیک یہ زیادہ تر شورش کا حسنِ نظر ہی ہے کہ اسے شہناز "رقاصہ فلک یا آکاش کی اپسرا" بن کر نظر آئی اور شورش کا توازنِ تحریر اس کے فنِ رقص کی موجوں میں تنکا بن کر بہ گیا۔

کتاب کا مجموعی اثر یہ ہے کہ فحش کا پیشہ نہایت نفرت انگیز ہے، فحش کی گلیاں نہایت غلیظ ہیں۔ فحش کے کاروباری نہایت مکروہ اور گندے ہیں، اور یہ ادارہ ہمارے معاشرے کے چہرے پر کوڑھ کے زخم سے کم نہیں ——

لیکن رقص و موسیقی فنونِ لطیفہ ہیں اور جو عورتیں اس فن میں کمال پیدا کرتی ہیں اور لطیفہ سنجی اور حاضر جوابی میں بھی مہارت رکھتی ہیں۔ وہ پسندیدہ ہیں قابلِ قدر ہیں۔ مستحق محبت ہیں لیکن شورش نے اس معمّے کو حل کرنے کی کوشش نہیں کی کہ "فنونِ لطیفہ عالیہ" رقص و موسیقی کے کمالات نے جسم فروشی کی لعنت سے اب تک کیوں نجات حاصل نہیں کی اور اعلیٰ درجے کی مغنّیہ و رقاصہ کے لیے زانیہ ہونا کیوں ضروری ٹھہر گیا۔

بہر کیف یہ کتاب شورؔش کے البیلے اندازِ تحریر۔ اس کے حُسنِ تخیّل اور اس کی لطافتِ ذوق کا مرقع ہے۔ ہماری زبان میں ایسی کتابیں بہت کم ہیں جن میں حُسنِ ظاہری اور جمالِ باطنی کو اس طرح جمع کیا گیا ہو ـــــ میں اس کتاب کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں۔

عبدالمجید سالک
کراچی

چہرہ نما

باور کیجئے اتنی دیر اس کتاب کے لکھنے میں نہیں لگی جتنی مدت اس سوچ میں صرف ہوئی ہے کہ اس کتاب کا انتساب ہو تو کیونکہ ہمارے ہاں ہر کتاب کے لیے انتساب ضروری ہو گیا ہے، عام طریق تو یہ ہے کہ اپنے کسی دوست یا بھائی یا بزرگ کے نام معنون کر دی جاتی ہے بعض مصنف اداروں کو ترجیح دیتے ہیں، بعض خاندان کے کسی فرد کو نذر گزرانتے ہیں اب ایک اور رواج بھی عام ہوتا جا رہا ہے کہ مصنّف پہلے تو بعض گفتنی و ناگفتنی یادوں کی عمارت کھڑی کرتا ہے اور پھر اس میں ارادت کی شمعیں جلاتا ہے ظاہر ہے کہ میرے سامنے اس رعایت سے کوئی عمارت یا ادارہ نہیں ہے۔ لے دے کے دوست رہ جاتے ہیں جس دوست کے نام پر غور کیا اس نے کانوں پہ ہاتھ دھرا کہ بھائی اپنی عاقبت تو خراب کر لی ہے ہماری دُنیا کیوں خراب کرتے ہو ان میں سے کئی دوستوں کا خیال ہے کہ میں نے یہ کتاب لکھ کر اپنی عزت میں کوئی اضافہ نہیں کیا ممکن ہے ان کا خیال درست ہو کیونکہ اس کی اشاعت سے چہ میگوئیوں کے بہت سے

دروازے کھلنے کا احتمال ہے۔ مجھے اپنے کچھ دوستوں کی اس رائے سے بھی اتفاق ہے کہ مجھ جیسے صحافی یا سیاسی کے لیے اس کتاب کے بعض پہلو بعض اعتبارات سے خطرناک ہیں جس ملک کے لوگ عیب بینی میں اتنے پختہ ہو چکے ہوں کہ عباؤں کے تار بیچ ڈالیں، اور داڑھیوں کے بال کُتر لیں وہاں یہ توقع رکھنا کہ جوانی تہمت کے بغیر گزر سکتی ہے۔ ایک "خوش آئند سانحہ" ہے۔ جوانی کا بغیر تہمت گزرنا بھی ایک دردناک المیہ ہی ہے۔

مجھے خود احساس ہے کہ اس پر کوئی حلقہ بھی خوش نہیں ہو سکتا جہاں تک اُس "بازار" کے اعوان و انصار کا تعلق ہے ان کی ناراضی تو سمجھ میں آتی ہے کہ مصنف نے ان کے چہروں سے نقابیں اُلٹ دی ہیں اور یہ ناراضی پس منظر کی ہے لیکن اس سے بھی بڑی ناراضی پیش منظر میں ہے اور وہ ہے اُن "علما" یا "فقہا" کی ناراضی جو ادب کو بھی "مسلمان" بنانے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ایسے لوگوں کی زندگی ماضی میں بسر ہوتی ہے، ان کا محور روایتی عقیدے ہیں، انھیں اپنی مصنوعی متانت کے سوا کوئی چیز بھی عزیز نہیں، ان کی ٹکسال صدیوں پرانے سکے ڈھالتی ہے، ان کے خیالات مضروب ہیں، ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ چلنے سے معذور رہے ہیں یہ محرکات پر غور نہیں کرتے، صرف نتائج پر جھنجلاتے ہیں اور ان کی جھنجلاہٹیں

بوڑھی ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے ان کی تصویر کھینچنے میں کمال کیا ہے ؎

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے یہ چوکتا بھی نہیں

ان لوگوں کے بوسیدہ عقیدوں میں نفع و ضرر کی حدیں زمانہ قبل از تاریخ سے استوار ہو چکی ہیں یہ محض قدما کو دیکھتے ہیں، وہ جو کچھ کہہ گئے ہیں ان کے نزدیک وہی حرفِ آخر ہے جس چیز پر جو مہر لگ چکی ہے وہ درست ہے، ان کے عقیدے اہرام مصر سے بھی قدیم ہیں، انہوں نے "کیوں ہے"؟ پر کبھی غور نہیں کیا؟ البتہ "کیا ہے" کو ضرور ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

عورت طوائف کیوں بنی؟ اس نے اپنا گوشت کیوں بیچا؟ اپنے بستر کو شارع عام بنایا تو کیوں؟ اس کے بازاروں میں طلوعِ تاریخ سے اب تک گہما گہمی چلی آتی ہے تو کیوں؟ کیا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ وہ زانیہ ہے لہذا اس کی سزا سنگساری ہے؟ اور جو لوگ ان کے کاروبار پر مصر ہیں وہ دیوث ہیں؟ محض نفرت اور مجرد اجتناب تو کوئی علاج نہیں یہ روگ اس وقت تک نہیں ٹل سکتا جب تک آپ اس کی تشخیص نہیں کر لیتے۔

آپ ایک کوڑھی کی بھی دیکھ بھال کرتے ہیں، تپدق کا ایک مریض بھی آپ کی مساعی کا مرکز بنتا ہے، ایک اندھے کے لیے بھی آپ کا دل اچھلتا ہے، لیکن اس اخلاقی طاعون پر آپ کیوں چیں بجبیں نہیں ہوتے؟ آپ کے اخلاق

کی آگ کیوں نہیں دھکتی ؟ آپ کا ضمیر کیوں نہیں ٹوکتا ؟ آپ چوری چھپے جسم تو خرید لیتے ہیں لیکن کبھی کھُلم کھلا ان سے یہ بھی پوچھا ہے کہ تم "یہ تاج محل" کیوں بیچتی ہو ؟ تم نے اجنتا کے ان غاروں کی عظمت کو رسوائی کے چوُلھے میں کیوں جھونک رکھا ہے ؟ تم نے مفروضے گھڑ رکھے ہیں کہ اچھی بیٹی ڈولی میں نکلتی اور کفن میں جاتی ہے ، لیکن ان "بازاریوں" کے نک سک پر تمہاری رال ٹپکنے لگتی ہے ، کیوں ؟ یہ بھی تو بیٹی ہی سے کسبی ہوئی ہیں ۔ آپ کہہ دیجئے ، ان کے بھی حواسِ خمسہ ہیں تمہاری طرح نہیں کہ تمہارے سامعہ و باصرہ کی موت واقع ہو چکی ہے ، اور اب حواسِ ثلاثہ ـــــ ذائقہ ، شامہ ، لامسہ پر جی رہے ہو ۔

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

مَیں نے یہ کتاب دسمبر ۱۹۴۹ء میں شروع کی ، اس وقت میرے سامنے محض ایک مقالے کا خاکہ تھا اور وہ مقالہ "چٹان" میں چھپ گیا ، لیکن وہ مقالہ ہر پہلو سے ادھورا تھا ۔ مرحوم مولانا عبدالمجید سالکؔ نے اس کو سراہا اور زور دیا کہ اس موضوع پر کتاب لکھ ڈالو ، ان کا خیال تھا کہ ہمارے ادیب زندگی کے کئی حقائق پر گفتگو تو کرتے ہیں لیکن زندگی کے راست مطالعہ سے کنی کتراتے ہیں ان کی اس ہمت افزائی کے باوجود میرے دل میں ایک ناتمام سا خوف کروٹیں لے رہا تھا پھر یہ خوف خدا کا خوف نہ تھا ، کیونکہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے ، یہ ایک انسان کا خوف

تھا ـــــ سید عطاء اللہ شاہ بخاری[1] کا خوف ـــــ جن سے مَیں نے اپنی جوانی کے بارے میں کچھ وعدے کیے تھے۔ الحمدللہ ان وعدوں کو توڑا نہیں، مَیں جانتا تھا کہ ان کے بعض حاشیہ نشین جنہیں میرے گوشت کی چاٹ پڑ چکی ہے کیا کچھ نہ کہیں گے؟ میری رسوائیوں کی کہانیوں سے ان کے کان پہلے ہی پک چکے تھے ممکن ہے میری اس کتاب سے انہیں صدمہ ہو۔ مجھے یاد ہے شاہ جی نے ایک دفعہ "لیلیٰ کے خطوط" پر نظر ڈالی تو ان کی پیشانی پہ کچھ بل آگئے تھے اور آج تک انہوں نے قاضی عبدالغفار کے قلم کو معاف نہیں کیا۔

پھر اس بازار سے صحیح سلامت گزر جانا بھی چنداں سہل نہ تھا دولت اور حُسن میں انسانی اعمال کی ہزاروں گمراہیاں پوشیدہ ہیں جب ریشمی آنچل دریچوں میں لہراتے اور گداز جسم ڈربوں سے جھانکتے ہیں تو بالاخانوں کی رونقیں خود بخود حلقۂ زنجیر پا ہو جاتی ہیں۔ وہ لمحے جوانی کے لیے بڑے ہی سنگین ہوتے ہیں جب پہلو میں خوبصورت جسم ہو اور سامنے کھلا بستر ـــــ اِدھر سیمیں باہنوں کے گجرے پکارتے ہوں، اُدھر گھنی پلکوں کے بے آواز کنایے۔ ان ہوشربا لمحوں میں اگر کوئی شخص سلامت نکل آتا ہے تو کہنا یہ چاہیئے کہ اس کی جوانی ابھی ادھوری ہے۔

میں تین برس تک ان مکانوں میں گھومتا رہا بیسیوں دروازے کھلے اور بند

---

[1] افسوس! شاہ جی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ہو گئے سینکڑوں عورتوں سے ہم کلامی کا موقع ملا کئی آہو چوکڑی بھول گئے کئی بلبلوں نے چہچہانا چھوڑ دیا، یہ بھی ہوا کہ راتیں آنکھوں میں کٹ گئیں بارہا ان مقبروں کی چلتی پھرتی لاشوں کو جھنجوڑا، ان کے قہقہوں کو فوارۂ خون میں ڈھالا ان کے گیتوں کی تانیں توڑ ڈالیں اور ان کے زاویہ ہائے رقص بدل دیئے ان کی مسکراہٹوں کو آزردہ کیا انہیں رونا سکھایا اور جو کچھ ان کے اندر تھا، اُگلوا لیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ دامن آلودگیوں سے پاک رہا یہ دل کی نیکی نہ تھی مجھے دل کی صحت پر اکثر شبہ رہا ہے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ ؎

قدم جو "راہِ محبت" میں ڈگمگاتے مرے
ہر ایک ذرّہ پُکارا کہ دیکھتا ہوں میں

عام خیال یہ ہے کہ گناہ افلاس کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے، میرا معاملہ اس کے برعکس تھا خالی جیب نے گمراہ ہونے سے بچا لیا۔

فی الجملہ یہ کتاب ان جسموں کا مرقع ہے، جن کی قیمت ہر رات چکائی جاتی ہے اس تصویر کے خطوط میں نے کھینچے ہیں لیکن رنگ بھرنے کے لیے خون ان سیاہ راتوں کے فروختنی چہروں سے لیا ہے گویا ؎

انہی کے "مطلب" کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات اُن کی

ایک طریق یہ تھا کہ میں اخلاقی وعظ کرتا اور اس کے لیے تبلیغی لفظ چنتا۔ لیکن

یہ میرے بس سے باہر تھا۔ اس قسم کے شرعی وعظ جن میں نفرت ہو انسان کو ضد پر ابھارتے ہیں۔ تھوررو کہتا ہے سچ کے لیے دو آدمیوں کی ضرورت ہے، ایک وہ جو سچی بات کہتے اور ایک وہ جو اُسے سُنے، اور یہ فضا ہمارے ہاں سرے ہی سے ناپید ہے۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ مَیں سیاسی محتسب کی حیثیت سے نقد و بحث کرتا، ظاہر ہے کہ اس سے بھی تصویر کا ایک ہی رُخ سامنے آسکتا تھا تیسرا طریق یہ تھا کہ میں مجرد تاریخ لکھتا، اوّل تو یہ ممکن نہ تھا، ثانیاً اُردو میں نیاز فتحپوری "جنسیات" پر ایک جامع کتاب لکھ چکے ہیں اور مَیں نے ابتدائی دو بابوں کے مواد کا ایک حصّہ اُسی سے اخذ کیا ہے، ثالثاً میرا موضوع محض تاریخ نہیں تھا بلکہ کچھ اور بھی تھا جس کی اہمیت آپ پر اس کے مطالعہ ہی سے واضح ہو سکتی ہے۔

مَیں نے جو کچھ لکھا ہے آپ اس کو ایک ادیب کی کاوش کہہ لیجئے۔ ایک ادیب کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ زندگی کا عکاس ہے وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس میں اپنے دل کی دھڑکنیں سمو دیتا ہے اور پھر اس کو روشنائی سے کاغذ کے صفحوں میں منتقل کرتا ہے۔ ممکن ہے بعض ادیب مجھے ادیب نہ سمجھیں کیونکہ ادبی دُکانداریوں میں میرا کوئی حصّہ نہیں ہے تو پھر آپ اس کو ایک صحافی کا اداریہ سمجھئے ایڈیٹروں کو عذر ہو تو خطیب کی بڑ کہہ دیجئے۔ جو مجذوب کی بڑ سے زیادہ قیمتی نہ سہی لیکن بڑ تو ہوتی ہے۔ بہرحال یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ

آپ اس پر کسی اُلجھن میں پڑیں آپ اس کو فقیر کے بول بھی کہہ سکتے ہیں، البتہ ایک چیز جو مجھے کھٹکتی ہے وہ ہے اسلوبِ بیان۔ آپ کہیں کسی فقرے کی دلکشی میں کھو جائیں اور جو کچھ بین السطور میں ہے اس کو طاق پر رکھ دیں تو یہ میری بد نصیبی نہیں آپ کی ہو گی۔ میں نے جو پیرایہ اختیار کیا ہے، وہ موضوع کی مناسبت سے درست ہے اصل چیز ظواہر نہیں بلکہ وہ اسرار ہیں جو تہ خانے میں ہیں۔

میں نے ان چار ساڑھے چار برس میں کوئی چھ سو لڑکیوں سے فحاشی کے اسباب کی چھان پھٹک کی ہے جو نتیجہ برآمد کیا وہ حسب ذیل ہے:۔

سبب	تعداد
انتہائی افلاس	۸۰
خاوندوں کی ترغیب	۴۸
خواہشاتِ نفسانی کی شدّت	۳۲
صحبتِ بد کا اثر	۴۵
والدین کی ترغیب	۵۲
عاشقوں کی بے وفائی	۴۸
سیاسی اغوا	۲۲
والدین سے ناراضی	۱۹

سبب	تعداد
سرپرستوں سے الجھاؤ	۱۴
گھریلو جھگڑے	۸
شوہروں کی دغا	۱۳
ادبی معاشقے	۹
تن آسانی	۹
مخلوط تعلیم	۲۸
ملازمت	۱۱
خاندانی پیشہ	۱۱۲
شوقیہ	۱۷
اتفاقیہ	۱۹
جوشِ انتقام	۱
اور دوسرے اسباب	۳۴
میزان	۶۰۰

آخر میں ایک اعتراض ہوسکتا ہے کہ میں نے روگ تو پیش کر دیا ہے لیکن علاج تجویز نہیں کیا اس قسم کی باتیں عموماً وہ لوگ کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے سیاسی ہم نُکلف ہوتے ہیں، میں نے چور بازاری کی نشاندہی کر دی ہے اب یہ کام

ارباب حل و عقد کا ہے کہ وہ اب بھی اپنی معذور عقلوں کا سہارا لیتے ہیں یا دستوریہ کی سفارشات کے تحت کوئی قدم بھی اٹھاتے ہیں۔

شورش کاشمیری

رہزنی کا پہلا شکار

عورت میں مجرمیت کی قائم مقام فحاشی ہے۔ ایک پیدائشی فاحشہ اخلاقی پاگل ہے۔ ایک مجرم اور ایک فاحشہ میں یکساں خصوصیتیں ہیں —— اخلاق کا فقدان، سنگدلی کا وجود، بدکاری کا میلان، تلوّن مزاجی، تن آسانی عارضی اور سطحی مسرّتوں کا شوق اور خود بینی و خود نمائی کا جذبہ۔

طوائف کا مستعمل مفہوم بازاری عورت ہے۔ ہر اس عورت کو جو اپنے جسم یا آواز کا بیوپار کرتی ہے — طوائف کہتے ہیں۔ ویسے لغت میں طائفہ کی جمع طوائف ہے اور طائفہ جوق (منڈلی) کو کہتے ہیں۔ چونکہ مصر میں رقاصاؤں کی ٹولی کو جوق کہتے تھے اس لیے طائفہ بھی جوق ہی کے معنی میں مستعمل ہوگیا۔ پھر رفتہ رفتہ طوائف نے جمع سے مفرد کے معنی پیدا کر لئے۔ اور اب اس کا اطلاق ہر اُس عورت پر ہوتا ہے جو پیشہ کماتی ہے۔ ان فاحشات کو ٹھیٹھ اُردو میں بیوا یا رنڈی بھی کہتے ہیں۔

یہ کہنا محال ہے کہ سب سے پہلی طوائف کون ہوئی ہے اس کا تعلق کس ملک یا قوم سے تھا، اُس کے باپ یا بھائی کون تھے، اور کس شقی القلب نے پہلے پہل

اس کو بیسوا بننے پر مجبور کیا۔ بہ ظاہر چند معلومات ہیں جو سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں یا بعض آثار و مظاہر ہیں جن سے ایک اندازہ استوار ہوتا ہے اور کچھ قیاس ہیں جن پر ایک عمارت کھڑی ہو سکتی ہے۔ ان سب کے مطالعہ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ دُنیا میں رہزنی کا پہلا شکار عورت کی عصمت ہوئی ہے اور غالباً انفرادی ملکیت کا تصوّر بھی اسی سے ماخوذ ہے ـــ یعنی محنت کے استحصال سے مدّتوں پہلے عصمت کا استحصال شروع ہو چکا تھا۔

جیسے جیسے معاشرہ بدلتا گیا عورت سے تعلقات کی نوعیتیں اور خصوصیّتیں بھی بدلتی گئیں۔ ہر زمانہ میں ایک نیا روپ رہا۔ معلوم نہیں دھات اور پتھّر کے زمانوں میں عورت اور مرد کے تعلقات کا صحیح نقشہ کیا تھا۔ لیکن سامنتی دَور کی ایک خاص مدّت تک ہر مرد عورت کو شہوانی غذا سمجھتا رہا اور اس کے حصول کا طریقہ شکمی غذا کے حصوؔل سے مختلف نہ تھا ایک طاقت ور قبیلہ کمزور قبیلہ کی آبادیوں پر چڑھائی کر دیتا۔ سردار گھوڑے پر سوار ہوتا۔ چند لوگ نقّاروں پر چوٹ لگاتے اور باقی نبرد آزما ہوتے، حملہ آور مفتوح مردوں کو قتل کر دیتے جو عورتیں مَردوں کے تخلیہ میں آ چکی ہوں اُن کو ہلاک کر ڈالتے۔ کنواریوں کو لشکروں میں بانٹ دیتے اور اس طرح فاتح بن کر لَوٹتے۔

(صحیفہ قاضیوؔن باب ۲۱ - آیت ۔ الغایتہ ۲۳)

بظاہر عجیب سی بات ہے۔ لیکن ایشیائی اقوام میں برات کا جو طریقہ

رائج ہے اس پر غور کرنے سے پتہ چلا ہے کہ شادی دراصل اس عسکریت ہی کے ثقافتی ارتقا کی ایک معاشری صورت ہے اور وہ زیور جو دلہنیں پہنتی ہیں ان عسکری فتحمندیوں ہی کی علامتیں ہیں مثلاً ہتھکڑیوں کا بدل چوڑیاں ہیں یا کڑے، بیڑیوں کی جگہ پاؤں کی جھانجنیں ہیں، طوق کی جگہ ہنسلی مالا اور کنٹھا ہیں۔ نکیل کی جگہ نتھ اور بالیاں ہیں۔ اسی طرح دلہن کے ماتھے پر جو سونے کا ٹیکا ہوتا ہے اس کی صورت عورت کے اندام پر ہے۔ اب بھی قیدی عورتوں کی جو صدیوں پرانی تصویریں دیکھنے میں آتی ہیں، ان سے اس کی توثیق ہوتی ہے۔

یہ دور گیا تو اشتراک فی النسواں کی بنیاد پڑی یعنی ایک عورت کو اس مرد کی ملکیت قرار دے دیا گیا جو اس کی دسترس رکھتا تھا، بعض محققین کا خیال ہے کہ فحش کے غیر شعوری مرض کا ابتدائی علاج نظام اُمہانی اور نظام بطریقی کا قیام تھا جو ہزار ہا تاریخی کروٹوں کے بعد مرد اور عورت کے موجودہ رشتوں تک پہنچا ہے۔ چنانچہ عورتوں کے فحش پر بسیوائی کی جو مہر لگی ہے اس کی عمر چند ہزار برس سے زیادہ نہیں۔ البتہ اس سوال پر خاصا اختلاف ہے کہ فحاشی عہدِ وحشت کی یادگار ہے یا نہیں؟

بعضوں کا خیال ہے کہ فحش کاری عہدِ وحشت سے بہت بعد کی چیز ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس عہد کا انسان اس تصور ہی سے خالی الذہن تھا۔ عورت اور مرد شروع ہی سے ازدواجی زندگی میں رہے ہے صرف ماحولی صورتیں بدلتی

رہیں۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ شروع شروع میں ازدواج کی تین صورتیں تھیں۔ اوّلاً مرد کئی بیویوں کا شوہر ہوتا۔ ثانیاً عورت کے کئی شوہر ہوتے۔ ثالثاً عورت اور مرد ایک محدود زمانہ کے لیے ایک دوسرے کے لئے مخصوص ہو جاتے تھے۔ چنانچہ عورت کے اسی فحش ہی کا نتیجہ دُختر کُشی کا رواج تھا۔

ایک اور عجیب بات جو ہمیں نظر آتی ہے وہ انسان کے ابتدائی مذاہب سے فحش کا گٹھ بندھن ہے۔ تمام مذاہب انسان کی دُکھتی ہوئی پیٹھ کو سہارا ... بننے کے لئے آتے تھے لیکن مرورِ زمانہ سے اُن کی اصلی رُوح تو ختم کر دی گئی ایک جسم باقی رہ گیا اور وہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا جو فحش کے مختلف محرکات کو بھی منجملہ عبادات سمجھتے رہے یہ تو انسان کے ابتدائی مذاہب کا حال تھا۔ خود عالمی مذاہب امتدادِ زمانہ کے باعث اپنے پیروؤں کی نفسی خواہشوں کا شکار ہو گئے اور رفتہ رفتہ انسانی فطرت کی کجروی نے ان میں بھی فحش کے لئے کوئی نہ کوئی گوشہ تلاش کر لیا۔ چنانچہ آج عالمی معاشرہ میں جتنی بھی فاحشات ہیں تمام تر "مذہبی" ہیں اور "مذہبی" اس مفہوم میں کہ وہ "خدا و آخرت" کے تصوّر پر ہماری ہی طرح یقین رکھتی ہیں۔

یُونان کے ایک مشہور سیّاح ہیروڈوٹس (۵۰۰ ق م) نے لیڈیا کے سفرنامہ میں شاہ الیاتیس کے مقبرہ کا جو حال لکھا ہے اس میں بتایا ہے کہ اُس کی تیاری میں جو رقم صرف ہوئی اُس کا بڑا حصّہ پیشہ ور عورتوں کا دیا ہوا تھا، اسی مؤرخ کا کہنا

ہے کہ عام لوگوں کی لڑکیاں پیشہ کماتی اور اپنے جہیز کے لئے روپیہ جمع کرتی تھیں۔ بابل کے لوگ اپنی عورتوں کو افرادیتہ دیوی کے مندر میں مردوں سے اختلاط کے لئے بھیج دیتے تھے۔ ان عورتوں کی چوٹی میں پھول گندھے ہوتے تھے یہ غیر مردوں کی راہ تکتیں جب کوئی عورت کسی مرد کو پسند آجاتی تو وہ اُس کی جھولی میں چاندی کا سکہ پھینک دیتا وہ چار و ناچار اُس سکہ کو قبول کر لیتی اور ساتھ ہو جاتی، گھر لوٹتی تو اُسے فخر کی چیز سمجھا جاتا تھا۔

یونان میں فلوریلیا دیوی کا میلہ آٹھ دن کے لئے لگتا تھا۔ اور ان آٹھ دنوں میں زائروں کے لئے روم کی لڑکیاں سامانِ عیش مہیا کرتی تھیں۔ افریقہ میں اعضائے جنسی عبادت کا جزو تھے اور لوگ انہیں اپنی اپنی دوکانوں اور مکانوں میں لٹکائے رکھتے تھے۔ ہندوستان میں اس کی نشاندہی شولنگ سے ہوتی ہے۔ زمانہ قبل از تاریخ کے تذکروں میں سوڈان اور دوسری آبادیوں کے متعلق اس قسم کی معلومات درج ہیں، یورپ کے غاروں سے قبل از تاریخ کے جو آثار ہاتھ آئے ہیں ان کی ہیئت سے بھی اعضاء تولید ظاہر ہوتے ہیں اور یہ سب صورتیں پتہ دیتی ہیں کہ اس تمدنی ارتقا سے پہلے تمام سماج میں فحش کا رواج تھا اور لوگ جنسی اشغال کو عبادت کا درجہ دیتے تھے۔

یہ تو خیر تاریخ سے پہلے کی باتیں ہیں۔ ولندیزیوں نے جس زمانے میں جاوا فتح کیا جنگل میں ایک توپ چھوڑ گئے۔ عوام نے سمجھا کسی دیوتا کا عضوِ مخصوص

ہے پوجا شروع ہو گئی۔ بانجھ عورتیں زرق برق لباس پہن کر توپ کی زیارت کو جاتیں اس پر گھوڑے کی طرح بیٹھتیں اور اولاد چاہتیں، پھول اور چاول چڑھائے جاتے آخر عیسائیوں نے حکومت پر زور دے کر اسے اٹھوا دیا۔

سکندرِ اعظم کے زمانے میں "مذہبی فحش" کا خاصا زور رہا۔ جب کوئی عورت اپنی ہمسائی کو طعن دیتی تو کہتی، تو اس قابل نہ تھی کہ تیرے کمر بند پر ہاتھ ڈالا جاتا اور یہ دیوی کے مندر میں سرفراز نہ ہونے کی طرف اشارہ ہوتا بائیبل میں فحاشی کے متعلق بہت سی روائتیں ہیں جب عبرانی کسی مسئلہ میں حلف اُٹھاتے تو زور دینے کے لئے اپنے عضو پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے تھے۔ چنانچہ شہادت اور (TESTAMENT) معاہدہ (TESTIMONY) (TESTICLE) خصیتین کا مادہ ایک ہی ہے، قدیم مصریوں میں عضو کو اُوپر اُٹھا کر قسم کھانے کا رواج تھا۔ اُن کے ہاں اولاد کے لئے جو تعویذ استعمال ہوتے تھے وہ اعضاءِ جنسی ہی کی مرموز صورتیں تھیں ڈیون پورٹ کا خیال ہے کہ ہندوؤں کا لنگم، یونانیوں کا فیلس، رومیوں کا سپر یاپس اور عیسائیوں کی صلیب مردانہ عضو ہی کی مرموز شکلیں ہیں۔ اس زمانہ کے دانشوروں کی جسارتوں کا یہ حال ہے کہ ڈاکٹر ل، الگزینڈر اسٹون نے گرجاؤں کی تعمیری ہیئت پر بحث کرتے ہوئے اسے بھی جنسی اعضاء کی بوقلمونیوں سے مماثلت دی ہے۔

ہمارے نزدیک یہ سب مادیت کی نگہ گستاخ کے کرشمے ہیں لیکن یہ بات ضرور

معلوم ہوتی ہے کہ ایک زمانہ میں فحش کو انسانی مذاہب کی سرپرستی حاصل رہی ہے اور یہ مذہبی فحاشی ہی کے برگ و بار ہیں جو مرور ایّام سے طوائف کے وجود میں منتقل ہو گئے ہیں۔

آج کی قحبہ عورتیں دراصل قدیم الایّام کی "مذہبی فاحشات" کا ردِ عمل ہیں۔ جن عورتوں کو یونان میں ہتائرہ، روم میں کنواری، بابل میں کادشتو، ہندوستان میں دیوداسی اور بغداد میں جواری کہا گیا ان ہی عورتوں کی تحریف کا نام طوائف ہے۔ اس بازاری فحش کے محرکات میں سے بعض یہ ہیں:۔

اوّلاً۔ معاشرے کا اخلاقی ارتقا جس سے متمدن ملکوں میں ازدواجی زندگی باضابطہ اور مہذب ہو گئی اور اس زندگی کو شہوانی انتشار سے بچانے کے لئے پیشہ وروں کو ایک ادارہ بنا دیا گیا۔

ثانیاً۔ مردوں اور عورتوں کے تناسب کا فرق جس سے خرابی کے برگ و بار پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ جن ملکوں میں یہ فرق بڑا نمایاں ہے وہاں فحاشی بھی اسی نسبت سے نمایاں ہے۔

ثالثاً۔ وہ افراد جن کی بے ڈھب عیاشیاں خاندانی عزتوں کے درپے ہوتی ہیں۔

رابعاً۔ طبقاتی سماج میں اقتصادی تفاوت اور انفرادی ملکیت کی مضرتیں۔

حکیم سولن دنیا میں پہلا شخص گزرا ہے جس نے خانہ بہ خانہ فحاشی کی روک تھام کے لئے یونان میں سب سے پہلا چکلہ قائم کیا۔ اور بزعم خویش ان جنسی کجرویوں

کو روکنا چاہا جن میں پورا یونان محصور تھا۔ تب یونانی قوم کی اخلاقی پستی کا یہ حال تھا کہ سب سے پہلے جن دو انسانوں کے مجسمے اظہارِ عقیدت کے لئے بنائے گئے ان میں ایک فاعل تھا دوسرا مفعول ـــــ ہرموڈیس اور ارسٹوگیٹن اگر کسی لڑکے کو چاہنے والا شہسوار نہ ملتا تو وہ شرم محسوس کرتا۔ اور ایسا لڑکا عزت کا مستحق سمجھا جاتا جس کے درجنوں عشاق ہوتے، کئی شہروں میں لڑکوں سے شادی رچانے کا رواج تھا۔ یونانی خرافیات میں ایسے مندروں کا ذکر موجود ہے، اور بعض کتبے ملے ہیں جن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ کئی محققوں کا خیال ہے کہ لڑکوں سے شادی کا رواج دراصل ضبطِ تولید کی طرف پہلا قدم تھا۔ خود سقراط نے اس فعل کو مستحسن قرار دیا حتیٰ کہ ارسطو نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ بیویاں ترک کر دیں اور استلذاذ بالمثل اختیار کریں۔ ان حکماء ہی کی توثیق و تحریک پر امرد پرستی خاص خاص لوگوں تک محدود کر دی گئی، یعنی صرف آزاد شہریوں اور بانکے شہزادوں ہی کو استلذاذ بالمثل کا حق حاصل تھا۔ غلام اس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے ان کے لئے یہ جرم تھا اور اس کی سزا موت تھی۔ جب یہ شوق عام ہو گیا تو اس کو ایک معاشرتی خوبی سمجھا گیا، یونانی حکومت نے اس کی سرپرستی کے لئے مختلف قانون نافذ کئے ـــــ اُدھر روما کی راجدھانی میں جو چکلے تھے وہاں عورتوں سے زیادہ لڑکے تھے۔ اِدھر پارس کو عجم کہتے تھے چنانچہ مذاقِ عجم کی ترکیب اخلاقی احوال کا ایک پورا نقشہ پیش کر دیتی ہے پارس سے یہ وبا اردگرد

کے ملکوں میں پھیل گئی۔ افغانستان سے بلوچستان اور سندھ تک پہنچ گئی۔ اُدھر چینی ترکستان میں عصمت فروش لڑکوں کا ایک طائفہ پیدا ہو گیا سر چارلس نیپیئر نے ۱۸۴۵ء میں جب سندھ فتح کیا تو کراچی میں زنانہ قحبہ خانوں کے علاوہ تیس اڈّے عصمت فروش لڑکوں کے بھی تھے۔

حضرت لوطؑ کی قوم کا ذکر توریت میں آ چکا ہے چنانچہ استلذاذ بالمثل کے لیے لواطت اسی سے ماخوذ ہے، توریت میں استلذاذ بالمثل کے بڑے مرکزی شہر کا نام سدوم بیان کیا گیا ہے انگریزی کا لفظ (SODOMY) اسی سے بنا ہے۔

یورپ میں کئی مسیحی فرمانرواؤں نے قحباؤں کی سرپرستی کی وہ ان کی آمدنی سے اپنا خزانہ بڑھاتے رہے۔ لیکن بعض نے ان کا قلع قمع کرنا چاہا، ایک ہزار برس تک نسلاً بعد نسلٍ اصلاح احوال کی کوششیں کی گئیں۔ یہاں تک کہ فاحشہ عورت کے لئے سزا مقرر ہو گئی، لیکن فحاشی کہیں بھی نہ رک سکی۔ بالآخر اُن کے ادارہ کو تسلیم کر لیا گیا۔ کوریات نے وینس کے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ سترھویں صدی کے آغاز میں بیس ہزار کے قریب کسبیاں ایسی تھیں، جن سے حکومت کو اتنا فائدہ ہوتا تھا کہ اس سے ایک درجن جنگی جہازوں کے مصارف پُورے ہوتے تھے۔

یُونان ڈھلا تو روما بڑھا، وہاں عورت کا درجہ نسبتاً وقیع تھا۔ لیکن روما کا آفتاب بھی ڈھل گیا اور فحاشی کا ایسا زور بندھا کہ سسرو جیسا معلّم اخلاق اور سحر بیان مقرر جس نے خطابت کے اصول مدون کئے ہیں، نوجوانوں کے کسبیوں سے حظ اُٹھانے

کی تائید کرتا ہے۔ ہر چند مسیحیت نے فحبگی کی روک تھام کی لیکن بعض انفرادی مساعی کے علی الرغم مسیحی ممالک وہ کھُل کھیلے ہیں کہ اب گناہ بھی آرٹ ہو گیا۔

عالمگیر مذاہب میں اسلام پہلا مذہب ہے جس نے عورت کو نصف کائنات سے تعبیر کیا، اس کے حقوق تسلیم کئے فحش کی مخالفت کی، زنا کو حرام قرار دیا اور چکلہ کے تصور ہی کو محو کر دیا لیکن جب مسلمان بادشاہوں کے دل و دماغ اسلامیّت کے تصور سے خالی ہو گئے تو سبھی بند ٹوٹ گئے یہ ایک عجیب سی حقیقت ہے کہ ایشیا کے اسلامی ملکوں میں فحبگی کو مسلمان بادشاہتوں نے پروان ہی نہیں چڑھایا بلکہ اُس کی کاروباری قبا میں بعض دلچسپ پیوند بھی لگائے ہیں، اور یہ صوُرت حالات ظاہر کرتی ہے کہ عورت بازار فحش کی جس منزل سے بھی گزری ہے اس کے ذمہ دار مرد ہیں اور صرف مرد۔ مرد نے عورت کو کھلونا سمجھا، چنانچہ مرد کی نفسی خواہشوں کے غلبہ کا نام ہی فحاشی ہے کوئی عورت فاحشہ ہونا پسند نہیں کرتی حتیٰ کہ ایک طوائف بھی نسوانی حیا سے تہی نہیں ہوتی ماسوا اُن عورتوں کے جن کی عادت پختہ ہو کر فطرت بن جاتی ہے کبھی کوئی عورت برضا و رغبت مختلف مردوں کا کھلونا بننا گوارا نہیں کرتی آپ کسی بھی کسبی کے دل کو ٹٹولئے اور اُس کی رُوح کے زخم سے کھرنڈ اُتار کر دیکھئے آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ محض اس لئے مونڈھے پر بیٹھتی ہے کہ اس کی "عورت" مر چکی ہے اور جو باقی ہے وہ عورت نہیں بستر ہے۔ دراصل جسمانی فحاشی ایک طاعوُن ہے۔ اس کا مریض بھی دِق کے مریض کی طرح چار و ناچار

زندگی بسر کرتا ہے۔

جن حکماء نے قحبگی کے انسداد کی تحریکوں کا جائزہ لیا ہے، اُن کا خیال ہے کہ قحبگی ناگزیر معصیت ہونے کے باوجود ایک مفید ادارہ ہے۔ جو معزّز گھرانوں کی عفت وعصمت کا پشتیبان ہے۔ ایک فلسفی شاعر کا قول ہے۔

کسبی اخلاق عامہ کی بد اخلاق نگراں کار ہے۔

بلزاکؔ لکھتا ہے طوائف خود کو جمہوریت پر قربان کر دیتی اور اپنے جسم کو معزز خاندانوں کا پشتیبان بنا دیتی ہے۔ شوپنہار کہتا ہے کسبیاں وحدت ازدواج کی قربان گاہ پر انسانی قربانیاں ہیں۔

لیکیؔ نے تاریخ اخلاق یورپ میں کسبیوں کو بے شمار خاندانوں کی پارسائی کا نگہبان قرار دیا ہے، ایک عجمی مصنّف نے لکھا ہے کہ اس معاشرہ میں استلذاذ بالضد کا بہت بڑا بوجھ طوائف کے کاندھوں پر ہے۔

ضروری نہیں کہ ہم ان رایوں سے اتفاق کریں ان کے مصنف غالباً سماج کے معاشی تعلقات پر غور نہیں کرتے حالانکہ جتنی خرابی ہے وہ طبقاتی ہے اور طبقاتی ملکوں ہی کے فکر و عمل نے طوائف کو ناگزیر معصیّت قرار دیا ہے۔

طوائف کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے اس نے اپنے "حسن و قبح" کے باوجود بڑے بڑے دماغوں پر حکومت کی ہے، کئی شہنشاہوں کو زیر نگیں کیا کئی مملکتوں کو اُجاڑا، کئی فرمانرواؤں کو جھکایا، عیاشوں کے خزانے لٹوا دیئے۔

سلطنتوں کی بنیادیں ہلا ڈالیں، حرمات شاہی کو خون کے آنسو رلوایا، نسل انسانی کو جنگوں میں جھونکا، اور جن کی گردنوں میں مگھلا ہوا سیسہ تھا انہیں مجبور کیا کہ موم بتی کی طرح پگھلیں۔ چنانچہ یورپ اور ایشیا کے اوراق تاریخ کا ایک بڑا حصّہ ان کے اذکار واشغال سے پُر ہے، مثلاً:-

طوطلیہ وی آرگونہ کی شعریات، ہسپانوی ادب کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں درونیکا فرانکو یونانی علم الاصنام کی ماہرہ ہوئی ہے۔ فرانس کا شہنشاہ ہنری سوم اس کی ملاقات کو حاضر ہوا تھا، اور چلتے وقت اس کی تصویر لے گیا تھا۔ نینون دی لنکلوس کے حسن وجمال کا اتنا شہرہ تھا کہ خاندان سیوزنہ کی تین پشتیں اس کے چاہنے والوں میں گذریں۔ اس کا مکان بڑے بڑے درباروں کو مات کرتا تھا۔ رہوڈوپی ایک مشہور کسبی ہوئی ہے جس نے مصری اہرام میں سے ایک ہرم بنوایا تھا۔ پیریکلیز کے متعلق پلوٹارک نے لکھا ہے کہ اس نے اسپاسیا نام کی ایک کسبی کو خوش کرنے کے لئے ایتھنز کو جنگ میں جھونک دیا۔ خود سقراط اس کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔

انقلاب فرانس نے تجگی کے ایک نئے دَور کو جنم دیا، ایک فرانسیسی مصنّف لکھتا ہے کہ اس انقلاب کی حیثیت جمہوری اور سیاسی ہے، اخلاقی اور روحانی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شراب خانے محلسرا بن گئے، بازاریاں بیگمیں ہوگئیں، اور بدچلن پناہ گزینوں نے ہم سب کو نستعلیق کر دیا۔ آج عیاشوں کے گروہ ہمارے

بازاروں میں چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں۔

صنعتی یورپ نے مقدس فحاشی کو تو قریب قریب ختم کر دیا لیکن اس کی جگہ مہذب فحاشی آ گئی فحش و گناہ کی نئی نئی تعبیریں کی گئیں۔ اخلاق کو اضافی شے کہا گیا، علانیہ بحثیں ہونے لگیں کہ عفت کس بلا کا نام ہے۔ تقویٰ کس کو کہتے ہیں؟ جو چیز مناکحت سے جائز ہو جاتی ہے وہ بغیر مناکحت کیوں جائز نہیں؟ جب ہاتھ ملانا کوئی جرم نہیں تو جسم ملانا کیوں جرم ہے؟ اچھائی یا برائی کا اپنا کوئی وجود نہیں دونوں ہمارے اپنے ہی فکر کا پرتو ہیں۔

فرانسیسی افسانہ نگاروں کی نوجوان پود نے ان نظریوں کی اشاعت کے لئے اپنا سارا زورِ بیان صرف کر ڈالا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ژورژساں ایک مشہور فرانسیسی ادیبہ ہوئی ہے جس نے جنسی تعلقات کی رنگارنگی پر زور دیا ہے۔ الغرض پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) میں یورپ نے اخلاقی قدروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ تمام یورپی ملکوں میں فرانس بازی لے گیا فرانسیسی اکابر کا ایک ہی نعرہ تھا ـــــ "بچے جنو اور جناؤ" مناکحت کی ضرورت نہیں، کنواری یا بیوہ جو عورت بھی وطن کے لئے رحم کو رضاکارانہ پیش کرتی ہے وہ عزت کی مستحق ہے۔ ان عورتوں کو امّ الوطن کا خطاب دیا گیا۔ ایک فرانسیسی قائد لکھتا ہے:۔

"پچھلے پچیس ۲۵ سال میں ہم کو اتنی کامیابی ہوئی ہے کہ "حرامی بچہ" حلالی

بچے کا ہم رتبہ ہو گیا ہے۔ اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ صرف پہلی ہی قسم کے بچے پیدا ہوا کریں تاکہ تقابل کا سوال ہی باقی نہ رہے۔"

ایک معلّمہ ناجائز بچہ جننے کے جرم میں معطل کر دی گئی تھی۔ اس کو فرانس کی وزارتِ تعلیم نے اس بنا پر بحال کیا کہ نکاح کے بغیر ماں بننا زیادہ جمہوری طریقہ ہے فرانس کے ۱۲۷ ویں ڈویژن کے کمانڈر نے دورانِ جنگ میں ایک حکم نامہ جاری کیا تھا جس کے الفاظ یہ تھے:۔

"معلوم ہوا ہے کہ فوجی قحبہ خانوں پر بندوقچیوں کے ہجوم اور اجارہ کی وجہ سے سوار اور پیادہ سپاہیوں کو شکایت ہے ہائی کمانڈ عورتوں کی تعداد بڑھانے کے لئے کوشش کر رہا ہے، جب تک یہ انتظام نہیں ہوتا بندوقچیوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ زیادہ دیر تک اندر نہ رہا کریں اور اپنی خواہشات کی تسکین میں عجلت سے کام لیں۔"

جنگِ عظیم نے تجارتی قحبہ خانوں ہی کو نہیں بڑھایا بلکہ خیراتی قحبہ خانے بھی قائم کئے۔ ان خیراتی قحبہ خانوں کا مقصد فوجیوں کی دلجوئی تھا، فرانس کی وزارتِ جنگ نے ان خیراتی قحبوں کو (WAR-GOOD-MOTHER) کا لقب دیا، اُردو اس کے ترجمے ہی سے معذور ہے۔ اب کئی برس سے فرانس میں قحبگی کا پیشہ انفرادی نہیں رہا بلکہ اجتماعی تجارت اور اجتماعی صنعت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ کئی لمیٹڈ کمپنیاں قائم ہیں، اُن کے کارندے بڑی بڑی تنخواہیں پاتے

ہیں۔ اخبارات میں ان کے اشتہارات چھپتے ہیں، جن ملازموں کے سپرد ملک کے مختلف حصوں سے ان "عروسانِ یک شب" کی فراہمی کا کام ہوتا ہے وہ اس پیشہ کی باقاعدہ فنی تربیت حاصل کرتے اور دفتری معیار پر کام چلاتے ہیں۔

جرمنی میں ڈاکٹر ماگنوش نے لواطت کے حق میں چھ سال تک جدوجہد کی اور حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ احتساب اٹھالے ڈاکٹر ماگنوش کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ جانبین رضامند ہوں تو حکومت کے لئے کونسا عذر رہ جاتا ہے؟ کیا اس سے مملکت کو نقصان پہنچتا ہے؟ کیا یہ زیادہ فطری طریقہ نہیں؟ جو لوگ اس کو غیر فطری کہتے ہیں اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں وہ محض ایک فرسودہ قول دُہرائے چلے جاتے ہیں، اس کے برعکس عورت کو مرد سے اختلاط کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، یا تو وہ ماں بن جاتی ہے یا بچّے ضائع کرتی ہے، لیکن لواطت میں اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں بلکہ اس ہم جنسی سے قحباؤں کی افزونی بھی رُک سکتی ہے۔

انگلستان بھی اسی تہذیب میں ڈوبا ہوا ہے اور اب تو وہاں امردپرستی قانوناً آزاد ہوگئی ہے۔ امریکہ میں قحبہ خانے آرٹ کے درجے میں ہیں۔ اس کی بدولت امریکہ میں ہر سال کم سے کم ۱۵ لاکھ حمل ساقط ہوتے ہیں اور وہ ہزارہا حرامی بچّے اس پر مستزاد ہیں جو موت کے گھاٹ اُتار دیئے جاتے ہیں۔ کئی سال ہوئے ہیں مجلسِ اقوام نے مختلف ملکوں سے فاحشات کے جو اعداد و شمار حاصل کئے تھے وہ برائے نام ہیں۔ جتنی فاحشات تمام عالمی ملکوں میں بیان کی گئی ہیں اُتنی

فاحشات ان میں سے کسی ایک ملک میں ہیں۔ اس بورژوا سماج نے (جو استحصال کے نقطۂ آخر تک پہنچ چکا ہے) دو چیزیں وافر کر دی ہیں (۱) محنت کی لوٹ کھسوٹ (۲) عصمت کی خرید و فروخت۔ سامنتی نظام کے ڈھیلا پڑ جانے کی وجہ سے پیشہ ور فاحشات تو ختم ہو رہی ہیں مگر اُن کی جگہ غیر پیشہ ور فاحشات نے لے لی ہے۔ ہر متموّل انسان کو ذہنی و جسمانی عیاشی کے لئے پُورے سماج پر دسترس ہے تمام معاشرہ ایک طوائف ہے اور پُورا آرٹ ایک چکلہ، رسّل کو اندیشہ تھا کہ آئندہ نصف دُنیا کے باپ وزراء ہوں گے یا پادری۔؟

ایک ہی تنور کی سوختہ

کمہار نے ایک خوبصورت آبخورہ بنایا، لوگوں نے اُس کو جام صہبا بنا لیا — کمہار نے ایک جام صہبا بنایا اور لوگوں نے اس کو آبخورہ سمجھ کر مسجد کی دیوار پر رکھ دیا تو پھر کیا اُس سے مٹی کی حقیقت بدل گئی؟ پیالہ میں چاہے شراب بھر دو چاہے زمزم —— عورت کو بیسوا بنا دو یا گھر کی ملکہ، جو چاہے بنا دو، لیکن ہر حال میں وہ عورت ہی ہے۔

(قاضی عبد الغفار)

ایشیا میں طوائف کا معاشری نظام یورپ کے معاشری نظام سے مختلف ہے لیکن جنسی اعتبار سے دونوں میں ہم رنگی ہے۔ دونوں بازاری شراب ہیں جو فرق ہے اس کی بڑی وجہ ایک تو مشرق و مغرب کے جُداگانہ اخلاقی نظریے ہیں، دوسرے عورت کے متعلق دونوں کے عقائد کا اختلاف ہے، ویسے یورپی عورت ایشیائی عورت سے سماجی آزادی میں کجروی کی حد تک آگے نکل چکی ہے اور شرم و حیا کے وہ معیار جو مشرق کی جان تصور ہوتے ہیں اس میں بالکل نہیں ہیں۔ اس

کے برعکس ایشیائی ملکوں میں ایک طوائف بھی کسی حد تک اخلاق کے ظواہر کی پابندی کرتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایشیا ہر بڑے مذہب کا مولد و مسکن رہا ہے ان مذاہب نے ایشیائی قوموں کو ایک اخلاق مہیا کیا جس سے ذہنوں میں اوامر و نواہی کا ایک تصور جاگزیں ہو گیا یہاں کسی فلسفی و مصنف کو یہ جرأت نہیں ہو سکی کہ فحاشی کا جواز پیدا کریں اور یہ کہیں کہ طوائف ایک ناگزیر ادارہ ہے۔

لیکن اس اخلاقی کر و فر کے باوجود ایشیائی ملکوں میں فحاشی محو نہ ہوئی اس کی مختلف صورتیں ہر حال میں اور ہمیشہ قائم رہی ہیں چنانچہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی تصنیف **کام شاستر** میں ہندوستان کی دھارمک فحاشی کا سراغ ملتا ہے۔ جنوبی ہند کے لوگ اپنی بیٹیوں کو مندروں کے بھینٹ چڑھا دیتے تھے جنہیں دیو داسیاں کہا جاتا، یہ کنیائیں سنگیت اور ناچ کی تعلیم حاصل کرتیں، جب تک جوانی کا روپ جھلمل جھلمل کرتا ان کے قدردان بھی موجود رہتے جب جوانی ڈھل جاتی تو انہیں مندروں سے نکال دیا جاتا در بدر بھیک مانگ کر گزارہ کرتیں ان سے کسی ذات کا کوئی ہندو شادی نہ کر سکتا تھا ان سے مندر کے مہنت خوش وقت ہوتے، یا تعلقداروں اور زمینداروں کو ترغیب دے کر انہیں داشتہ رکھنے پر آمادہ کیا جاتا تھا۔

ہندوستان میں دھارمک فحاشی کا ایک بڑا ثبوت لنگم ہے، یہ ٹھیک ہے کہ آریائی تہذیب نے عورت کو ازدواجی سکون مہیا کیا۔ وہ جس مرد کی شریک زندگی

ہوتی اس کی موت پر اُس کے ساتھ ستی ہوجاتی۔ لیکن عورت کے جسم کو ہمیشہ ہی خطرہ رہا اور اس وقت سے رہا جب لکشمن نے سروپ نکھا کی ناک کاٹی، راون نے سیتا پر ہاتھ اُٹھایا اور پانڈو دروپدی کو ہار گئے۔

منوسمرتی میں بیاہ کی آٹھ قسمیں بتائی گئی ہیں، آٹھویں قسم "پشاچ بواہ" ہے جس کے معنی ہی حرام کاری کے ہیں۔ بائبل میں عبرانیوں کی حرامکاری کا ذکر ہے عرب میں حضورؐ کی بعثت سے پیشتر بیت اللہ کے دروازے پر زنا کے قصیدے معلق تھے۔ مکہ میں جو فاحشہ عورتیں تھیں وہ باندیوں میں سے تھیں۔ عبید اللہ کا باپ زیاد اسی ٹھہنی کا پتا تھا۔ مورخوں کا خیال ہے زیاد امیر معاویہؓ کے والد ابوسفیان کے سلب سے تھا امیر معاویہؓ نے اسی تعلق پدری کا واسطہ دے کر زیاد کو حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے الگ کیا تھا۔ لیکن اُس دور قبل از اسلام میں بھی کوئی آزاد عورت فاحشہ نہ تھی حالانکہ عورتوں کا عشق عربوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ شوہر خوش ہوتا تھا کہ اُس کی دلہن کا عاشق پہلے سے موجود ہے، اکثر خاوند بیوی کو اپنے پہلے عاشق سے ملنے اور اُس کا چرچا کرنے سے بھی نہ روکتے تھے وہ اس کو فخر سمجھتے تھے کہ اُن کی بیوی فلاں شاعر کی محبوبہ ہے اور اُس کے حُسن وجمال اور عفت وطہارت کا تمام عرب میں ڈنکا بج رہا ہے۔

ایک بدو سے پوچھا گیا کہ تمہارے ہاں عشق کا مفہوم کیا ہے اُس نے کہا ہم محبوبہ کو سینہ سے بھینچ کر اُس کے ہونٹوں سے ہونٹ پیوست کر دیتے لعاب دہن

سے شادکام ہوتے اور اُس کی دلآویز باتوں سے دل زندہ کرتے ہیں، ایک عرب شاعر کا قول ہے:۔

"محبوبہ کے دو حصے ہیں۔ ایک سراسر محبت کے لئے، دوسرا شوہر کا جس پر کبھی آنچ نہیں آتی۔"

حضرت زرتشت نے بدکار عورتوں کے لئے تباہی کی دعا کی ہے۔ ترکستان میں کسبیوں کے بڑے بڑے بازار تھے اور ان کے مکانوں میں جانا خلافِ اخلاق نہ تھا، مشرقی چین میں فحاشی تجارتی بنیادوں پر قائم رہی۔ وہاں کسبیوں کا وہی درجہ تھا جو یونان میں ہتائرہ کا تھا۔ عام چینی انہیں پھول والیاں کہہ کر پکارتے تھے اب ماؤ کی حکومت نے قحبہ خانوں کو سرے ہی سے کالعدم کر دیا ہے، جاپان کی رنڈیوں کے سکونتی بازار کا نام یوشی واڑہ ہے اور انہیں بعض قانونی مراعات حاصل ہیں۔ کوریا میں طوائف کو گیسا تنگ یعنی ورق النور کہتے ہیں۔ روس، چین اور حجاز ان تین ملکوں میں عورت کے لئے جسم فروشی ممنوع ہے، مؤخرالذکر تو اسلام کا مولد ہے، لہٰذا وہاں کسی فرد یا حکومت کو اس قسم کی جرأت ہی نہیں ہوسکتی اوّل الذکر دو ملکوں میں اشتراکیت کا دَور دَورہ ہے اور اشتراکیت اس قسم کے ادارہ کو سرمایہ داری کی ظالمانہ پیداوار سمجھتی ہے۔ علامہ حلبی کا قول ہے کہ اسلام نے فحش اور قحبگی کا قلع قمع کر دیا تھا۔ حضورؐ سرورِ کائنات فداہ اُمّی و ابی کی وفات کے بعد پہلی صدی تک دُنیائے اسلام کے اندر عصمت فروشی بالکل

مفقود رہی، لیکن جب اسلامیت کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور مسلمان بادشاہتیں قیصر وکسریٰ کے نقشِ قدم پر چل نکلیں تو جگہ جگہ لہو ولعب کا بازار گرم ہو گیا اور یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ بیشتر عباسی خلفاء نے عورت کو کھلونا بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ (الاّ ماشاء اللہ) اب جواری کھلونے تھیں اور کھلونے جواری، جو عروج با کمال عباسی خلفاء کے عہد میں انہیں حاصل ہوا، اس کی نظیر کسی دور میں نہیں ملتی، ایک طرف انہیں فنی تربیت دی گئی، دوسری طرف اُن کے اقتدار کو تسلیم کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بڑی بڑی سلطنتیں اُن کے حُسن وجمال سے ہل گئیں۔ کئی خلفاء نے ان کے اشارۂ ابرو پر تاج وتخت قربان کئے۔ کئی بادشاہ ان کی ایک جنبشِ لب پر نثار ہو گئے، ادھر رنڈیوں کے طائفے بھی نکھرتے گئے، ان میں بھی خاندانی وغیر خاندانی کا فرق قائم ہو گیا، جو محض گانے والی تھیں وہ مغنّیہ کہلائیں، مصر میں انہیں عالمہ کہتے ہیں، جو ناچنے والی تھیں وہ رقّاصہ ٹھہریں اور جو صرف جسم بیچتی تھیں اُنہیں طوائف کہا گیا۔ ادھر ہندوستان میں مغلوں نے اور بھی گُل کھلائے — ظاہر ہے کہ طوائف عشرت کی چیز ہے اور مرد نے اسی لئے اس کو تخلیق کیا ہے جب مقصد عشرت ہو اور وہ بھی نفسی، تو پھر وہ تمام لوازم یکے بعد دیگرے جمع ہوتے جاتے ہیں جن سے نفس کو تسکین ہو چنانچہ طوائف کے ساتھ وہ تمام سامانِ عشرت جمع کر دیا گیا ہے جن سے عیاشی فن ہو گئی اور طوائف — فن کار۔

اِدھر جواری (کنیزیں)، نتیجہ تھیں جنگ کا، جب فتوحات کا سیلاب ٹھہر گیا

تو اِن کی فراہمی بھی رُک گئی جس سے ایک خلا۔ پیدا ہوگیا۔ اُدھر مسلمان خلفا۔ اسلامیت کی روح کھو چکے تھے اور صرف ظواہر کے پابند تھے، انہیں رجھانے کے لئے کنیزوں کو درآمد کیا گیا جس سے بردہ فروشوں کا گروہ پیدا ہوگیا جو ترکیہ، صقلیہ، ہندوستان آرمینیا، روم اور افریقہ سے نوجوان لڑکیاں لاتا اور بغداد میں فروخت کرتا تھا، اُن کی سب سے بڑی مارکیٹ کا نام سوق الرقیق تھا جہاں بیشتر مکان اکثر دوکانیں اور متعدد احاطے واقع تھے۔ تمام ملکوں کی کنیزیں حُسن و خُوبی کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ رکھی جاتیں، سب سے قیمتی کنیزیں مدینہ، طائف، بصرہ، کوفہ، بغداد اور مصر کی ہوتیں، ایک تو ان کا لہجہ مصفا ہوتا دوسرے حاضر جواب ہوتیں، خود بادشاہوں کی پیشانیاں اُن کے کمال سے بھیگ جاتی تھیں۔ اسی بازار کا ایک حصّہ نوآمد کنیزوں کے لئے مخصوص ہوتا اُنہیں عریاں حالت میں لایا جاتا، بال کھُلے ہوتے، کوئی سنگار نہ ہوتا۔ مقصود یہ تھا کہ خریدار طبعی حُسن کا جائزہ لے سکیں۔ مختلف تاجر حُسن و رعنائی کے معیار پر اُن کی قیمت لگاتے اور دام چُکا کر خرید لیتے۔ تاجر اس خام مال کو تعلیم و تربیت کی کٹھالی میں ڈال دیتے جب وہ پختہ ہوجاتیں تو انہیں بہت گراں قیمت پر فروخت کیا جاتا۔ چنانچہ اکثر موسیقار، عالمہ، فاضلہ اور مدّبر عورتیں ان کنیزوں ہی میں سے ہوئی ہیں، ان کے بطن سے بڑے بڑے خلفا۔ اور اُمرا۔ بھی پیدا ہوئے ہیں۔

تمام بازار مختلف الاصل لونڈیوں سے پُر ہوتا۔ بڑے بڑے تجّار اور

اُمرا، جمع ہوتے، فروخت آواز لگاتا۔

"اے تاجرو! اے دولت مندو! نہ ہر گول چیز اخروٹ ہوتی ہے اور نہ ہر مستطیل چیز کیلا، ہر وہ چیز جو سُرخ ہے گوشت نہیں، اور نہ ہر سفید چیز چربی ہے، اسی طرح نہ ہر صہبا شراب ہوتی ہے اور نہ ہر زرد چیز کھجور، اے تاجرو یہ ایک بیش بہا موتی ہے، زرِ خطیر بھی اس کی قیمت نہیں ہو سکتا۔ پھر بتاؤ کہ تم کیا قیمت لگاتے ہو۔"

ایک ایک کنیز کئی کئی ہزار درہم میں نیلام ہوتی، گاہکوں کو حق ہوتا تھا کہ وہ انہیں عُریاں حالت میں بھی دیکھ سکیں چنانچہ اہلِ عرب نے مختلف ملکوں کی کنیزوں کے احوال و اوصاف پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً:۔

نجابت کے لئے فارس، خدمت کے لئے روما، کھانے پکانے کے لئے حبشہ اور بچوں کی تربیت و رضاعت کے لئے آرمینیا کی لونڈیاں معیاری سمجھی جاتی تھیں۔

حُسن ظاہری کے لحاظ سے چہرہ ترکی کا، جسم روم کا، آنکھیں حجاز کی اور کمر یمن کی پسند کرتے تھے۔ اس بردہ فروشی کے ماہر اتنے زیرک تھے کہ وہ کسی لونڈی کو اس کی ذہانت کے قیافہ پر خرید لیتے تھے، متوکل کے پاس چار سو کنیزیں تھیں۔ ہارون الرشید کے پاس دو ہزار جن میں سے تین سو اربابِ نشاط تھیں، ام جعفر برمکی کے پاس کئی ہزار لونڈیاں تھیں، ہارون الرشید نے ایک کنیز کو ایک لاکھ

دینار میں خرید کیا تھا۔ سلیمان بن عبدالملک کے بھائی سعید نے اپنی لونڈی زلفا کے ستر ہزار دینار ادا کئے تھے۔

جعفر برمکی نے ایک کنیز کو چالیس ہزار دینار میں حاصل کیا، کبھی کبھار عباسی خلفاء خرید کے سوال پر برہم ہوجاتے، کتاب الاغانی اور عقد الفرید میں اس قسم کے کئی واقعات درج ہیں، ہارون الرشید تخت پر بیٹھا تو حکم دیا کہ فلاں لونڈی ایک لاکھ دینار دے کر خرید لی جائے۔ یحییٰ بن خالد (وزیر سلطنت) نے عذر کیا۔ رشید برہم ہوگیا، یحییٰ نے تمام روپیہ اس کے کمرے میں بکھیر دیا، رشید سمجھ گیا کہ یحییٰ نے اس کے اسراف پر چوٹ کی ہے، امین نے جعفر بن ہادی سے کہا بذل نام کی کنیز کو خرید لو، جعفر نے انکار کیا امین کو غصہ آیا اور حکم دیا کہ بذل کو سونے میں تلوا کر خرید لو، تعمیل کی گئی۔ اس سونے کی قیمت دو کروڑ درہم تھے۔

پھر ان لونڈیوں کو امورِ سلطنت میں جو دخل رہا وہ مخفی نہیں، ان کے کارناموں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ یزید بن عبدالملک کا عشق حبابہ کے ساتھ اور رشید بن عبدالملک کا عشق ذات الخال کے ساتھ تاریخی شہرت رکھتا ہے، ہارون الرشید کی ماں خیزران خود کنیز تھی، مقتدر کی ماں بھی کنیز تھی اور ملکی سیاسیات پر ان کا جو اثر تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

جہاں کہیں مسلمان بادشاہتوں کے "ڈھیر" گئے ان کے ساتھ لونڈیوں کا ادارہ بھی گیا، جب خلافت ملکی حدوں میں بٹتی گئی تو یہ بھی ان کے ساتھ تقسیم ہوتی گئیں۔

خلیفہ عبدالرحمٰن اندلسی کی کنیزیں خاص شہرت رکھتی تھیں بالخصوص قصرِ لبنا کی کنیزیں جو بڑی ہی نامور تھیں۔

فاطمہ خلیفہ کی خفیہ تحریریں لکھتی، اُس کو شعر و انشا میں اتنی دستگاہ تھی کہ کوئی مرد بھی اس کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکا۔ خدیجہ نے شعر و غنا میں نام پیدا کیا۔ مریم نے خاندان اشبیلیہ کی لڑکیوں کو شعر و انشا کی تعلیم دی، رقیہ نے شعر و حکایت میں وہ کمال پیدا کیا کہ خلیفہ عبدالرحمٰن نے اس کو آزاد کر دیا۔ جب عبدالرحمٰن انتقال کر گیا تو اُس نے مشرق کا سفر کیا ہر جگہ کے علماء نے اُس کی آؤ بھگت کی۔

ان لونڈیوں نے شعر و غنا میں ایجادیں کیں، انہی کی بدولت اُمرائے سلطنت قتل کیے گئے۔ مامون الرشید نے علی ابن ہشام سے اس کی ایک خوش جمال کنیز کو طلب کیا، علی نے انکار کیا مامون الرشید نے برہم ہو کر ابنِ ہشام کو قتل کروا ڈالا۔

ہارون الرشید نے رات کی تنہائی میں کسی کنیز سے چھیڑ چھاڑ کرنی چاہی اُس نے صبح پر ٹال دیا، صبح ہوئی تو ہارون نے بلوا لیا وہ حاضر ہو گئی ہارون نے وعدہ شب یاد دلایا، کنیز نے ارتجالاً کہا ـــــ ع

كلام الليل يمحوه النهار

چراغ حسن حسرت نے اردو میں ترجمہ کیا ہے ؎

رات کی بات کا مذکور ہی کیا
چھوڑیئے رات گئی بات گئی

ہارون مسکرا کر نکل گیا، تمام ملکی شعرا سے کہا کہ وہ اس مصرع پر گرہ لگائیں ابونواس سب میں بازی لے گیا، اس نے تضمین کے مصرعوں میں ہارون الرشید کی دراز دستی کا پورا واقعہ بیان کر دیا۔

یہ واقعہ ہے کہ مسلمان فرمانرواؤں نے (الّا ماشاء اللہ) جواری کے جواز سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کے محلوں میں سیکڑوں عورتیں اس طرح رہی ہیں جیسے سونے کے قید خانے میں ہوں، ان کی ازدواجی زندگی اصلاً یا معناً اساری کی زندگی سے مختلف نہ تھی ہر شاہی دور اور ہر شاہی محل میں قریب یہی ہوتا رہا ہے۔

میڈم کلی برزلی نے جو ایک ترک وزیر کی اہلیہ تھی، ایک کتاب لکھی ہے "حرم کے تین سال" اس میں سلطان عبد المجید کے حرم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی بیگمیں راستہ چلنے والوں کو جھروکوں سے بلایا کرتی تھیں جب ان سے متمتع ہو چکتیں تو افشائے راز کے خوف سے مروا دیتیں۔

ایک دفعہ خدیو مصر محمد علی کی بیٹی نازلی خانم کے شوہر نے کسی کنیز سے ہاتھ دھلوانے کے لئے کہا۔ ہاتھ دھو چکا تو کنیز سے کہا، بس بس پیاری! یہ سننا تھا کہ نازلی خانم کو تاؤ آگیا لونڈی کے قتل کا حکم دے دیا، اس کی کھوپڑی میں چاول بھر کر تنور

میں پکوائیے، جب خاوند خاصہ پر بیٹھا تو اُس کے سامنے رکابی رکھ کر کہا، اپنی پیاری کا بھی ایک لقمہ کھا کر دیکھو۔ شوہر نے سُنا تو بھڑک اُٹھا اور محل سے نکل گیا۔

مغلوں کا ہندوستان میں ورُود ـــــ ایک مؤرخ کے الفاظ میں ـــــ اسلام کے دَورِ انحطاط کی یادگار ہے۔ اُن کا اسلام کی بنیادوں سے کچھ گہرا تعلق نہ تھا، جب انہیں ہندوستان میں سلطنت کا سکون ملا تو اُن کا جسمانی عیش اپنے پیشروؤں سے منزلوں آگے نکل گیا۔ اُن کے عشرت کدوں کی دھاک بیٹھ گئی، ان کے گھر دو پیش عجمی اور ہندی حُسن جمع ہو گیا، وہ ذہانت جس سے عربی لونڈیوں کا شہرہ تھا عجمیوں میں بھی سرایت کر گئی۔ ہمایوں شکست کھا کر ایران پہنچا تو اُس کا غم غلط کرنے کے لیے دارا۔ ئے ایران نے ایک مجلسِ نشاط منعقد کی، تمام گویّے مدعو کیے گئے، ایک مغنّیہ نے غزل چھیڑی:۔

ہمایوں منزلے کاں خانہ راما ہے چنیں باشد ــــ مبارک کشورے کاں عرصہ راشا ہے چنیں باشد
زرنج وراحت گیتی مشو خنداں مرنجاں دل ــــ کہ آئین جہان گاہے چناں گاہے چنیں باشد

ہمایوں کا دل بھر آیا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شاہ نے دیکھا تو مغنّیہ کو مجلس سے اُٹھوا دیا لیکن اس برجستہ ذہانت کی تحسین کیئے بغیر نہ رہ سکا۔ جب ہمایوں نے دہلی کو دوبارہ فتح کیا تو اس مغنّیہ کو بُلا بھیجا، پتہ چلا کہ وہ انتقال کر چکی ہے۔ شہنشاہ اکبر کی داستانہائے نشاط سے تاریخ بھری پڑی ہے، وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے مینا بازار لگوایا۔ مینا بازار کا تصور ترکستان سے مستعار تھا۔ ہر مہینے کی تیسری تاریخ

کو قلعہ معلیٰ میں بازار لگتا۔ اس کو خوش روز بھی کہتے تھے۔ تمام اہتمام اُمرائے سلطنت کی عورتوں کے سپرد ہوتا۔ خواجہ سرا، قلماقنیاں اور اُردبیگنیاں اِدھر اُدھر گھوڑے دوڑاتے پھرتیں، مالنیں چمن آرائی کرتیں، جہانگیر نے بزمانہ شہزادگی مینا بازار ہی میں نواب زین خاں بہادر کی بیٹی صاحب جمال کو دل دیا تھا مینا بازار کے انگوری پارک سے گزر رہا تھا، ایک خادمہ نے عرض کیا۔ صاحبِ عالم! آپ کو بادشاہ سلامت یاد فرماتے ہیں۔ شہزادہ کے ہاتھ میں کبوتروں کا جوڑا تھا، صاحب جمال سامنے سے آ رہی تھیں، اس سے کہا لو ذرا ہمارے کبوتر تھامنا، ہم ابھی آتے ہیں۔ واپس آئے تو صاحبِ جمال کے ہاتھ میں ایک ہی کبوتر تھا، پوچھا:۔

"دوسرا کبوتر کیا ہوا؟"

"صاحبِ عالم وہ تو اُڑ گیا؛"

"کیسے؟"

صاحب جمال نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا اور کہا۔

صاحبِ عالم — "یوں"

اس "یوں" پر جہانگیر لٹو ہو گیا بالآخر صاحبِ جمال اس کے عقد میں آگئی۔ لاہور کے سیکریٹریٹ میں انارکلی کا جو مقبرہ ہے وہ دراصل اسی صاحبِ جمال کا ہے بعض افسانہ نگاروں نے کبوتروں کے واقعہ کو نور جہاں سے منسوب کیا ہے جو غلط ہے، اسی طرح انارکلی کا تمام واقعہ بھی فرضی ہے۔

ایک روز جہانگیر کسی ایرانی شہزادے سے اس شرط پر شطرنج کھیل رہا تھا کہ جو ہارے کنیز دے۔ اتفاق سے جہانگیر ہار گیا۔ تمام کنیزیں اکٹھی کی گئیں، سب حسن وجمال میں ایک دوسرے پر فائق تھیں۔ جہاں نام کی ایک کنیز کو بڑے تردّد کے بعد چُن لیا گیا۔ جہاں کو ہم جولیوں سے بچھڑنا گوارا نہ تھا عرض کیا۔

تو بادشاہِ جہانی جہاں ز دست مدہ   کہ بادشاہِ جہاں را جہاں بکار آید

بادشاہ رُک گیا۔ حیات نام کی ایک دوسری لونڈی کو منتخب کیا تو اس نے ارتجالاً عرض کیا۔

جہاں خوش است ولیکن حیات می باید   اگر حیات نہ باشد جہاں چہ کار آید

جہانگیر نے ایک تیسری کنیز دلآرام کو تجویز کیا وہ خود شطرنج کی ماہرہ تھی۔ عرض کی صاحبِ عالم مجھے ایک دفعہ بساط دکھا دیجئے پھر کوئی فیصلہ فرمائیے گا۔ درخواست منظور کر لی گئی۔ دلآرام نے غور کیا اور شاہ سے کہا

شاہا دو رُخ بدہ و دل آرام را مدہ

پیل و پیادہ پیش کُن و اسپ کشت مات

جہانگیر بازی جیت گیا۔ دلآرام کو اعزاز و انعام سے نوازا۔ آج تک یہ شعر شائستہ کھلاڑیوں کے نوکِ زبان ہے۔

جہانگیر کی ایک بیوی راجہ اودے سنگھ کی بیٹی مان متی تھی۔ شاہجہان اسی کے پیٹ سے تھا۔ تمام محل میں مان متی کے گانے کا شہرہ تھا جہانگیر خود موسیقی کی نوک پلک

سے واقف تھا اللہ اُس نے اپنی بہت سے خواصوں کو موسیقی کی تعلیم و تربیت کے لئے اسی کے سپرد کر رکھا تھا۔ اسی زمانے میں بزرگی کشمیری نام کی ایک طوائف کا بڑا نام تھا ایک دن اُس کی صحبت میں بہت سے اہلِ عجم بیٹھے تھے کہ ایک عرب بھی جا پہنچا۔ عجمیوں کو شرارت سُوجھی اور یہ رُباعی لکھ کر اُس کے پاس بھیج دی ؎

اے شیوہ کفر و دیں بہم ساختہ — غم را بوجود و عجم ساختہ
آثار بزرگی ست از جنبیت پیدا — کہ با عرب و گہ با عجم ساختہ

بزرگی میں بھی شعر کا ملکہ تھا جواب میں لکھا ؎

رو نے کہ نہادیم دریں دہر قدم را
گفتیم صلائیست عرب را و عجم را

"گفتیم صلائیست عرب را و عجم را" پر غور کیجئے، ایک طوائف کی کاروباری سیرت بہ تمام و کمال نظر آئے گی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے "غبارِ خاطر" میں صاحب مآثر الامراء کے حوالے سے اورنگ زیب کی از خود رفتگی کا ایک واقعہ لکھا ہے، فرماتے ہیں:-

"برہان پور کے حوالی میں ایک بستی زین آبادی کے نام سے بس گئی تھی اسی زین آباد کی رہنے والی ایک مغنیہ تھی جو زین آبادی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے نغمہ و حُسن کی تیر افگنیوں نے اورنگ زیب کو زمانہ شہزادگی میں زخمی کیا، صاحب مآثر الامراء نے اس واقعہ کا

ذکر کرتے ہوئے کیا خوب شعر کہا ہے ؎

عجب گیرندہ دامے بود در عاشق ربائی ہا
نگاہِ آشنائے یار پیش از آشنائی ہا

اورنگ زیب کے اس معاشقہ کی داستان بڑی ہی دلچسپ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اولوالعزمیوں کی طلب نے اُسے لوہے اور پتھر کا بنا دیا تھا لیکن ایک زمانہ میں گوشت و پوست کا آدمی بھی رہ چکا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہم یمین الدولہ کے داماد میر خلیل خان زمان کا تذکرہ کر رہے تھے۔ اس خان زمان کی بیوی اورنگ زیب کی خالہ ہوتی تھی، ایک دن اورنگ زیب برہان پور کے باغ آہو خانہ میں چہل قدمی کر رہا تھا اور خان زمان کی بیوی یعنی اُس کی خالہ بھی اپنی خواصوں کے ساتھ سیر کے لئے آئی ہوئی تھی خواصوں میں ایک خواص زین آبادی تھی جو نغمہ سنجی میں سحر کار اور شیوۂ دلربائی و رعنائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی سیر و تفریح کرتے ہوئے یہ پورا مجمع ایک درخت کے سایہ میں سے گزرا، جس کی شاخوں میں آم لٹک رہے تھے جونہی مجمع درخت کے نیچے پہنچا زین آبادی نے نہ تو

شہزادہ کی موجودگی کا کچھ پاس لحاظ کیا نہ اُس کی خالہ کا، بے باکانہ اُچھلی اور ایک شاخِ بلند سے ایک پھل توڑ لیا، خان زمان کی بیوی پہ یہ شوخی گراں گذری اور اس نے ملامت کی تو زین آبادی نے ایک غلط انداز نظر شہزادہ پہ ڈالی اور پشواز سنبھالتے ہوئے آگے نکل گئی۔ یہ ایک غلط انداز نظر کچھ ایسی قیامت کی تھی کہ اس نے شہزادہ کا کام تمام کر دیا اور صبر و قرار نے خدا حافظ کہا ؎

بالا بلند عشوہ گر سروِ ناز من

کوتاہ کرد قصّۂ زہد دراز من

صاحب مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ "بکمال ابرام و سماجت زین آبادی را از خالہ محترمہ خود گرفتہ، باآں ہمہ زہد خشک و تفقہ بحت، شیفتہ و دلدادہ او شدہ قدح شراب بدست خود پُر کردہ می دادگویند روزے زین آبادی ہم قدح بادہ پُر کردہ بدست شہزادہ داد و تکلیف شرب نمود"، یعنی بڑی منت و الحاح کر کے اپنی خالہ سے زین آبادی کو حاصل کیا اور باوجود اس زہد خشک اور خالص تفقہ کے جس کے لئے اس عہد میں بھی مشہور ہو چکا تھا اس کے عشق و شیفتگی میں اس درجہ بے قابو ہو گیا کہ اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ بھر بھر کر پیش کرتا اور عالم نشہ و سرور کی رعنائیاں دیکھتا، کہتے ہیں کہ ایک دن زین آبادی

نے اپنے ہاتھ سے جام لبریز اورنگ زیب کو دیا، اور اصرار کیا کہ اسے لبوں سے لگائیے، دیکھئے عرفی کا ایک شعر کیا موقع سے یاد آگیا ہے اور کیا چسپاں ہوا ہے۔

ساقی تو نئی وسادہ دلی ہیں کہ شیخ شہر
باور نمے کنند کہ ملک مے گسار شد

شہزادہ نے ہر چند عجز و نیاز کے ساتھ التجائیں کیں کہ میرے عشق و دل باختگی کا امتحان اس جام کے پینے پر موقوف نہ رکھو۔

مے حاجت نیست مستیم را
در چشم تو تا خمار باقیست

لیکن اس عیار کو رحم نہ آیا۔

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد
مسلمانی بیاموز آں دو چشم نامسلماں را

ناچار شہزادے نے ارادہ کیا کہ پیالہ منہ سے لگائے گویا ولقد ھمت بہ وھم بہا کی پوری روئداد پیش آگئی۔

عشقش خبر ز عالم مدہوش آورد
اہل صلاح را القدح نوش آورد

لیکن جونہی اس فسوں ساز نے دیکھا کہ شہزادہ بے بس ہو کر پینے کے لئے آمادہ ہو گیا ہے فوراً پیالہ اس کے لبوں سے کھینچ لیا اور کہا۔

غرض امتحانِ عشق بود نہ کہ تلخ کامیٔ شما

این جور دیگر است کہ آزار عاشقاں   چنداں تمے کند کہ بہ آزار خو کنند

رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ شاہجہاں تک خبریں پہنچنے لگیں اور وقائع نویسوں کے فردوں میں بھی اس کی تفصیلات آنے لگیں۔ داراشکوہ نے اس حکایت کو اپنی شکایت و غمازی کا دست مایہ بنایا۔ وہ باپ کو بار بار توجہ دلاتا۔ "ببینید این مُزوّر ریائی چہ صلاح و تقوی ساختہ است"؟ ملا فیضی نے کیا خوب کہا ہے ؎

چہ دست می بری اے تیغ عشق گرداداست   ببر زبانِ ملامت گر زلیخا را

نہیں معلوم اس قضیہ کا غنچہ کیونکر گل کرتا لیکن قضا و قدر نے خود ہی فیصلہ کر دیا یعنی عین عروج شباب میں زین آبادی کا انتقال ہو گیا اورنگ آباد کے بڑے تالاب کے کنارے اس کا مقبرہ آج تک موجود ہے۔

اورنگ زیب کے بعد سلطنت کا آفتاب گہن میں آ گیا، تمام ملک میں عالمگیری ہلینٹ اکھڑ گیا، شمشیر و سناں طاقِ نسیاں پر چلے گئے اور اُن کی جگہ طاؤس و رباب نے لے لی۔ ہر کوئی عیاشیوں میں ڈوبا ہوا تھا، ہر کہیں طوائف الملوکی کا دَور دَورہ تھا، ہر کسی کی آنکھ کا پانی مر چکا تھا، ہر گھر میں وضع داریوں نے دانت نکوس دیئے تھے۔ القصہ تمام ملک لہو و لعب کا ایک عبرت ناک مرقع تھا۔ غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کی بیٹیوں اور بہوؤں کو ننگے بدن ناچنے پر مجبور کیا — وہ ناچنے لگیں اور خود خنجر کھول کر بظاہر غافل ہو گیا۔ وہ ناچ چکیں تو خنجر اٹھایا اور کہا، غیرت تیمور

کے گھر سے واقعی رخصت ہو چکی ہے۔

محمد شاہ نے نادر شاہ درانی کی مدارات کے لیے نور بائی ڈومنی کو گوایا۔ نادر شاہ اس کے نورانی گلے سے بڑا ہی خوش ہوا، انعام دیا، لیکن ساتھ ہی کہا۔

نور بائی روئے ہند سیاہ کن۔ بیا کہ بہ ایرانت بریم،

نور بائی کا رنگ فق ہو گیا لیکن پھر سنبھل گئی اور یہ غزل گائی ؂

من شمع جانگدازم تو صبح دلربائی — سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی
نزدیکت این چنینم دُور آنچناں کہ گفتم — نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

نادر شاہ اس برجستہ و برمحل غزل سے بہت محظوظ ہوا اور اپنے ارادہ سے باز رہا۔ الغرض ان خوش جمالوں سے بادشاہوں کی تاریخ بھری پڑی ہے اور جن عورتوں کو ہم فاحشہ کہتے ہیں وہ اصلاً ان بادشاہتوں ہی کے تنور کی سوختہ ہیں۔

طاؤس و رباب آخر

"کس قدر افسوسناک بات ہے کہ زندگی کے سبق ہمیں اُس وقت ملتے ہیں جب وہ ہمارے لئے بیکار ہو جاتے ہیں"۔۔۔۔ آسکر وائلڈ

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں سب سے پہلا چکلہ محمد تغلق نے اپنی راجدھانی دولت آباد کے نزدیک طرب آباد کے نام سے قائم کیا۔ ہر روز عصر کے وقت چکلہ کا چودھری وسطی بُرج میں آ بیٹھتا تمام رنڈیاں اور گوّیے باری باری مجرا بجالاتے، پھر جب سُورج ڈوب جاتا تو بازار سجتا، خریدار آتے، اسی رامش و رنگ میں صبح ہو جاتی۔ امیر شمس الدین تبریزی سب سے بڑا درباری گوّیا تھا جس کے ماتحت دربار کی بیسیوں رنڈیاں اور گوّیے تھے۔ اُس دور کے چکلوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی عمارتوں اور رنڈیوں کے کوٹھوں میں اکثر و بیشتر مکانی قرب رہا تمام پچھلے ملک یا صُوبے کی راجدھانی کے اُس حصّے سے ملحق ہوتے جہاں قلعہ ہوتا یا امراء سلطنت کے محل، مثلاً شہنشاہ اکبر نے آگرہ میں فتح پور سیکری کے پاس رنڈیوں کے لئے شیطان پورہ آباد کیا تھا۔ دہلی میں چاندنی چوک اور قلعہ معلی

سے ملحق چاوڑی بازار تھا۔ لکھنؤ کا چکلہ واجد علی شاہ کی عمارتوں کے نزدیکی راستہ پر ہے۔ خود لاہور کو دیکھتے شاہی قلعہ اور لاہور کے چکلے میں چند ہی قدم کا فاصلہ ہے۔ اب امتدادِ زمانہ سے لاہور کی ہیئت کذائی کافی زیر و زبر ہو چکی ہے لیکن شہر کی جغرافیائی بناوٹ سے اس کے آثار اب بھی مل جاتے ہیں۔ قلعہ کی پیٹھ پر بارودخانہ تھا اس کے آگے موتی بازار، نشیبی سمت پر شاہ عالمی دروازہ، اور دائیں کو مڑ کے چکلہ جو آج بھی بازار چوک چکلہ کہلاتا ہے۔ چوک چکلہ سے لوہاری دروازہ کو نکل آئیے تو انارکلی بازار ہے۔ اس فرضی طوائف ہی سے جہانگیر کے عشق کی داستان منسوب کی جاتی ہے۔

قریب نصف صدی پہلے انارکلی میں طوائفیں بیٹھا کرتی تھیں، لاہور میونسپلٹی کی تجویز پر اُن کو اُٹھا دیا گیا اُس وقت سے ہیرامنڈی کا علاقہ ان کے لئے مخصوص ہے۔

چکلہ کا لفظ کیونکر وضع ہوا؟ اس پر لسانیات کے ماہر ہی وثوق سے کچھ کہہ سکتے ہیں۔ لغت میں چکلہ کے معنی قحبہ خانہ کے ہیں۔ اس کا مادہ چکیدن ہوا جس کے معنی جانور کے اڈے پر بیٹھنے کے ہیں۔ دو مصدر اور ہیں چکاندن اور چکانیدن جو ٹپکانے کے معنی میں آتے ہیں، چکلہ کا لفظ ان سے بھی ماخوذ ہو سکتا ہے۔ خود چک کا لفظ مختلف المعنی ہے زمین کے معنی میں بھی آتا ہے، اور مردانہ عضو کے لئے بھی، اسی طرح چکلہ کی املا غور طلب ہے ــــ صحیح املا چکلہ

ہے یا چکلا، پہلی صورت میں "لہ" کے معنی پردہ کے ہیں اور دوسری صورت میں "لا"، انگوری شراب کو بولتے ہیں۔ ان مختلف المعنی اشکال پر غور کرنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ چکلہ کی معنوی خصوصیت انہی الفاظ میں کہیں نہ کہیں ضرور ہے۔

آہستہ آہستہ رنڈیوں کے صفاتی ناموں میں ان کی پیشہ ورانہ بوقلمونی سے اضافہ ہوتا گیا بالخصوص اس دور میں جب سلطنت اودھ پر شجاع الدولہ اور پھر واجد علی شاہ کا پرچم لہرا رہا تھا اور دہلی میں محمد شاہی امراء عورتوں کو چوسر کی نردیں سمجھتے تھے۔ اشرف صبوحی کے الفاظ میں۔

"شہزادے پانی میں پالتی مارے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ایک زانو پر پیچوان لگا ہے دوسرے پر رنڈی بیٹھی ہے، دھنواں اُڑاتے اور ملہار سنتے چلے جاتے ہیں"

یہ زمانہ سلطنت کی ویرانی کا تھا، صرف ظاہری رسموں اور معنوی رواجوں کا طنطنہ باقی تھا جس نسبت سے بازو کی قوت گھٹتی گئی اسی نسبت سے زبان کی نزاکت بڑھتی گئی، جن کا پیشہ ناچنا اور گانا تھا اُن کو طوائف کہا گیا، جن کا کاروبار بدن کی فروخت ٹھہرا وہ کسبیاں کہلائیں یا کنچنیاں اور جو محض "بازاری مال" تھیں۔ یعنی روپے اور جسم میں تبادلہ کرنے والی وہ ٹکیائیاں ٹھہریں۔ اُن کے لئے بیسوا رنڈی، پاتر اور دیبشیا کے لفظ بھی مستعمل ہیں۔ جن میں ایک باریک سا معنوی فرق ہے اور اب تو بعض کمین ذاتیں بھی ان میں محسوب ہوتی ہیں مثلاً مراثنیں

ڈومنیاں اور پیرنیاں وغیرہ ـــــ کنچن کوئی ذات نہیں صرف پیشے کی رعایت سے ایک ذات بن گئی ہے اور اب ہر اس جمعیت انسانی کو کنچن کہتے ہیں جن کا تعلق طوائفوں اور کسبیوں کے خاندان سے ہوتا ہے۔

شجاع الدولہ اور واجد علی شاہ کے لکھنؤ نے طوائفیت کی مختلف شاخوں کو پروان چڑھایا۔ شاہی عیش طلبیوں نے چکلے کی نوعی تہذیب اور اربابِ نشاط کے مخصوص تمدن کو زندگی کے بال و پر بخشے۔ جس سے دیکھتے آنکھوں ایک ایسا معاشرہ پیدا ہو گیا کہ مسلمان بادشاہوں کی پوری تاریخ میں طوائف کے عروج کی اتنی بڑی مثال نہیں ملتی۔

شجاع الدولہ نواب صفدر جنگ کا بیٹا تھا، جب اس کی انگریزوں سے صلح ہو گئی تو اس نے فیض آباد کا سفر اختیار کیا۔ احمد خاں بنگش نے اس کو قصدِ سفر سے پہلے تین نصیحتیں کیں، اولاً مغلوں پر اعتبار نہ کرنا، ثانیاً فیض آباد کو دارالحکومت بنانا، ثالثاً خواجہ سراؤں سے کام لینا۔ شجاع الدولہ نے ان تینوں باتوں کو آویزۂ گوش بنا لیا، پہلا کام یہ کیا کہ فوج کی کمان خواجہ سراؤں کو سونپ دی۔ سب سے بڑے ڈویژن میں چودہ ہزار سپاہی تھے جن کی وردی کا رنگ سرخ تھا۔ خواجہ سرا بسنت علی خاں کو ان کا کمانڈر بنایا، اسی نام کے ایک دوسرے خواجہ سرا کی ماتحتی میں ایک ہزار سیہ پوش گھڑسوار تھے۔ خواجہ سرا عنبر علی کی زیر ہدایت پانچ سو گھڑسواروں کا دستہ اور خواجہ سرا محبوب علی کی ماتحتی میں پانچسو شہسواروں کی چار پلٹنیں، ایک اور خوش چہرہ

خواجہ سرا لطافت علی کے ماتحت فوج کے اتنے ہی دستے تھے۔ علاوہ ازیں شجاع الدولہ کے دربار میں بہت سے زنانہ اور مردانہ طائفے تھے۔ شررؔ مرحوم نے لکھا ہے کہ شجاع الدولہ کا دل ہمیشہ خوبصورت عورتوں اور دلفریب رقاصاؤں کے بانکپن کا شکار رہا، تمام شہر اور اس کے کوچہ و بازار طوائفوں سے پٹے تھے یہاں تک کہ سلطنت کا چپّہ چپّہ النّاس علی دین ملوکھم کی جلوہ گاہ بنا ہوا تھا، کئی نامور ڈیرہ دارنیاں تھیں جن کے ہمراہ عالیشان خیمے رہتے تھے، جب شجاع الدولہ سلطنت کے مختلف اضلاع کا دَورہ کرتا تو بادشاہ کے ہمراہ خیمے بھی ہوتے، جہاں جی چاہتا خیمے لگا دیئے جاتے محفل جمتی اور آناً فاناً رقص و نغمہ کا چمن آراستہ ہو جاتا۔ واجد علی شاہ کے عہد میں شجاع الدولہ کا لگایا ہوا پَودا ایک تناور درخت بن گیا۔ حتیٰ کہ واجد علی شاہ اور لہو و لعب ہم معنی الفاظ ہو گئے واجد علی شاہ بچپن ہی سے حُسن و نغمہ کی گود میں پلا تھا۔ اور ابھی سن شعور کو بھی نہ پہنچا تھا کہ اس کی عمر کے بہت سے اُجلے ورق طوائفوں کی ہم آغوشی سے داغدار ہو چکے تھے، جب تخت پر بیٹھا تو عورتوں سے اس کی رغبت کا یہ عالم تھا کہ اس نے فوج کی کایا پلٹ دی، رسالوں کا نام بانکا، ترچھا اور گھنگھور رکھا۔ پلٹنوں کے نام اختری اور نادری، جو دو مشہور طوائفوں کے نام پر تھے اور جنہیں وہ ممتوعہ کہتا تھا، واجد علی شاہ متعہ کو مذہباً جائز سمجھتا تھا۔ ہر وہ عورت جو اس کی ہوس کا شکار ہوتی اس کو ممتوعہ کے خطاب سے نوازتا۔ ایک دفعہ بھنگن پر جی آگیا تو نہ صرف اُسے فیضیاب کر ڈالا بلکہ نواب مصفّا بیگم کے لقب سے ملقب کیا، اسی طرح بہشتن

پر دل للچایا تو اُس کو نواب آب رساں بیگم بنا ڈالا ان چہلوں اور چوچلوں میں اس کا جواب نہیں تھا۔ واجد علی شاہ مسلمان فرمانرواؤں میں پہلا بادشاہ تھا جس نے خُوب صُورت عورتوں کی ایک چھوٹی سی فوج بنائی۔

آج فوجوں میں جو زنانہ دستے نظر آتے ہیں۔ وہ غالباً اُسی نظیر پر قائم ہیں خود بادشاہ کا وزیر علی نقی خاں اربابِ نشاط میں سے تھا۔ اُس کی بیٹی نواب اختر محل شاہ کی ملکہ تھیں، اکثر نابالغ اور کم سِن لڑکیاں بادشاہ کی نظر کا شکار ہو جاتیں، تو انہیں غیر ممتوعہ بنا کر رکھ لیا جاتا۔ اور جوان ہوتے ہی ممتوعہ بنا لیا جاتا پھر مختلف حالات میں اُن کے سپُرد گانے اور ناچنے کا کام ہوتا یہ اتنی زیادہ تھیں کہ اُن کے طائفے بنا دیئے گئے ہر طائفہ کا نام اُس کی خصوصیت پر رکھا گیا مثلاً:۔

رادھا منزل والیاں، جھومر والیاں، لٹکن والیاں، سار دھا منزل والیاں، نتھ والیاں، گھُونگھٹ والیاں، رہس والیاں، نقل والیاں اور اچھوتیاں۔ ان میں اکثر بادشاہ کے قریب سلطان خانہ میں رہتیں۔ بعض کو کوٹھیوں میں محل سرائیں ملی ہوتی تھیں۔ جس کے ہاں بچّہ پیدا ہوتا اُسے محل کا خطاب دیا جاتا جو صاحبِ اولاد نہ ہوتی اس کو بیگم کہتے۔ بیگموں کی تنخواہ روٹی کپڑے کے علاوہ چھ سے بیس روپے ماہانہ ہوتی البتّہ محلّات کے زمرے میں آتے ہی دو سو روپے ماہوار ہو جاتے اور رہنے کو محل سرا اور ڈیوڑھی میں دربان وغیرہ دیئے جاتے تھے۔ ہر ممتوعہ کا نام چُن کر رکھا جاتا۔ پری جمال بیگم، حور شمائل بیگم، گُل رخ بیگم اور نازک اندام بیگم۔

اسی طرح محلات کے نام ہوتے تھے۔ نواب خاص محل صاحبہ، نواب معشوق محل صاحبہ، نواب دلدار محل صاحبہ، نواب عاشق سلطان محل صاحبہ، نواب ممتاز محل صاحبہ، نواب اختر محل صاحبہ، نواب قیصر محل صاحبہ —— اور یہ کوئی ستّر کے قریب ممتوعات و محلات تھیں۔ انہی عیاشیوں کی بدولت واجد علی شاہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بدبختی کا آخری مرقّع تھا۔ اُس نے ناچ اور گانے میں وہ ایجادیں کی ہیں کہ اب تک بڑے بڑے اُستادانِ فن اس کا لوہا مانتے ہیں وہ کئی راگنیوں اور نرتوں کا مُوجد اور معلّم تھا۔ کوئی رقاصہ کہیں چُوکتی تو پلنگ پر لیٹے لیٹے بھاؤ بتا کر اصلاح کر دیتا۔ کسی گوّیے کی آواز میں کوئی عیب ہوتا تو فوراً ٹوک دیتا۔ خود تال اور سُر کی ایک ایک ادا کا مزاج داں تھا۔ اس کا وجود عیش و عشرت کا پیکر تھا۔ کبھی کبھار اپنے اُوپر زنگی کی کیفیت طاری کر لیتا اور بچہ جنتا۔ اس پر دربار میں مبارکبادیں چلتیں، نیازیں بٹتیں، مُجرے ہوتے۔ جب انگریزوں نے قید کر کے کلکتہ پہنچا دیا۔ تو وہاں بھی عیش و عشرت ہی کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ جن ممنوعات کا عشق سر پر سوار تھا انہیں قید خانہ سے عشقیہ خطوط لکھتا، اُن سے کچھ نہ کچھ مانگ بھیجتا، مثلاً دلدار محل سے مسّی مانگی، اختر محل سے زُلفوں کے بال، انہیں سرہانے رکھ کر سوتا اور بار بار سُونگھتا، جعفری بیگم سے دولائی دوپٹہ منگوایا جس سے لپٹ کر بار بار روتا۔ غرضیکہ واجد علی شاہ نے ایک ایسے لکھنؤ کو جنم دیا جو عیش و نشاط کے سانچے میں ڈھل

کر خود ایک کسبی ہو گیا تھا۔

لکھنؤ میں رنڈیوں کے تین طائفے تھے:۔

کنچنیاں، یہ پنج ہندو ذات کی پیشہ ور عورتیں تھیں، جنہوں نے پنجاب سے نقل مکانی کر کے فیض آباد میں ڈیرے ڈالے تھے، انہیں کے دم قدم سے لکھنؤ کا چکلہ آباد تھا۔

چونہ والیاں، یہ تعداد میں دوسرے درجہ پر تھیں۔ ان کا کام ناچنا اور گانا تھا ان میں حیدر بائی چونے والی مشہور طوائف گزری ہے، جس نے نور کا گلا پایا تھا۔

ناگرنیاں، یہ پچمیل مٹھائی تھیں جن میں ہر قوم کی فاحشہ عورتیں ضم ہو گئی تھیں، ان کی برادری کا دائرہ بہت پھیلا ہوا تھا لیکن ڈیرہ دارنیاں فصیح محاورہ تھیں جنہیں ہر شخص استعمال کر سکتا تھا فی الجملہ ان کا وجود روزمرہ تھا۔

حیدر بائی کی آواز میں جادو تھا، گوہر بائی کا رقص اس بلا کا تھا کہ الہ آباد کی نمائش میں یورپین محوِ حیرت رہ گئے، کچھ عرصہ بعد زہرہ و مشتری کا طوطی بولنے لگا، زہرہ تو خود شاعرہ تھی۔ قدرت نے آواز میں سحر بھر دیا تھا یہ شعر اسی کا ہے ؎

رات کا خواب الٰہی توبہ
آپ سنئیے گا تو شرمائیے گا

مشہور فلم سٹار نرگس کی ماں جدّن بائی اس محفل کی آخری شمع تھی۔ مولانا عبدالحلیم شرؔر نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ اس کو مورپنکھی ناچ میں وہ کمال حاصل تھا کہ نرت نرت پر وقت ٹھہر کر اس کی اداؤں سے چشم سیر ہوتا تھا۔

اسی زمانے میں طوائفوں نے بعض پیشہ ورانہ اصول وضع کیے اور اپنی معاشرت میں بعض ایسے الفاظ شریک کیے جن سے ان کی معصیت ڈھک گئی۔ مثلاً وہ کسی مرد سے مقرّرہ مشاہرہ پر زناشوئی کے تعلقات قائم کرتی تو پیشہ کی اصطلاح میں اس کو ملازمت کہتے تھے یہ رواج اب بھی ہے، ایک طوائف جس مرد سے مشاہرہ پر تعلقات قائم کرتی ہے اُس کا بدن اسی کے تصرّف میں رہتا ہے لیکن رقص و نغمہ کے لیے اس کا دروازہ ہر ایک کے لیے کھُلا ہوتا ہے۔

یہ تھا لسنتعلیق لکھنؤ ـــــ مگر محمد شاہ رنگیلے کی دہلی کا اخلاقی انحطاط اس سے بھی افزوں تھا۔ نواب درگاہ قلی خاں نے اس عہد کا تذکرہ لکھا اور خواجہ حسن نظامی نے اُس کو اُردو میں منتقل کیا ہے۔ ایک اقتباس بہ تصرف ادنیٰ ملاحظہ کیجئے:۔

"جدھر نگاہ اُٹھا کر دیکھیے دہلی کے خوش باش لوگ زندگی کی بہار لُوٹنے میں مشغول ہیں، ہر کوچہ و بازار میں حسن و عشق کے معرکے ہیں، ہر درخت کی چھاؤں میں عاشق و معشوق رنگ رلیاں کرتے نظر آتے ہیں ہر میدان میں محبّوں اور محبوبوں کی ٹولیاں سیریں کرتی اور

جھومتی نظر آتی ہیں۔ ہر باغ میں الھڑ حسینوں اور خوش چہرہ لڑکوں اُن کے شیدائیوں اور دلفگاروں کے راز و نیاز کی محفلیں جمی ہوتی ہیں ـــــ یہ رات کے ابتدائی حصّے کے منظر ہیں، جب رات زیادہ آجاتی تو بس دہلی والوں میں بھی شباب کی اُمنگیں زور مارنے لگتی ہیں اور وہ محتسبوں یا راہ گیروں سے بے نیاز ہو کر بے اندیشہ اور بے خطر ہوس رانی میں لگ جاتے ہیں۔ نوخط مرد محبوبی اور معشوقی کا کام کرتے ہیں لیکن بعض بعض لوگ اس کو پسند نہیں کرتے وہ عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور یہ کوئی دشوار کام نہیں کیونکہ اس قسم کی آوارہ عورتیں بکثرت موجود ہوتی ہیں۔"

میر کلّو ایک آزاد منش نوجوان ہے اس کو امیرزادوں اور نوجوانوں کی طبیعت پر قابو ہے اور ہمیشہ دلجوئی و خاطرداری کے لئے ان کی خواہشوں کو پورا کرتا ہے، اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ عیش و نشاط کے لوازمات میں کسی چیز کی کوتاہی نہیں کرتا، میرزا آشرف کے عُرس پر جب اُمرا اور ان کے صاحبزادے آتے ہیں تو ہر کوئی اپنے ہمراہ کم سن اور طرّار معشوقہ یا نوخط امرد کو لاتا ہے اُن کا قیام میرزا کلّو کے خیموں میں ہوتا ہے جو ہر ایک کے لئے الگ الگ فاصلہ پر باغ میں لگے ہوتے ہیں، جس کا جو جی چاہتا ہے کرتا ہے کوئی محتسب

نہیں ہوتا، تمام سامانِ عیش و رندی پہلے سے تیار رہتا ہے۔ ہر ایک معشوق کے ساتھ شراب کے دَور چلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ پس اس منزل پر پہنچ کر نفسانی خواہشات آزادی کے ساتھ پُوری کی جاتی ہیں۔ امیر الامراء اعظم خاں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ہر خُوب صُورت عورت اور خوش چہرہ لڑکے کو حجلۂ ہوس میں لانے کے لِئے کوشاں رہتا تھا۔ میرزا منو امرد پرستی میں یگانۂ روزگار تھا انہی امراء میں ایک خوش باش لطیف خان تھا اس کے ہاں ہر شب محفل جمتی، مغنیے حاضر ہوتے، حُقّے خُوشبوؤں میں بسے رہتے۔ ہر ایک کے سامنے گلاب پاش رکھے ہوتے اور تمام مکان رات بھر اندر سبھا بنا رہتا۔ طوائفیں آتیں مُجرے ہوتے اور جب تک رات تا یہ کہ نہ آ پہنچتی اُس وقت تک بادۂ انگور و بادۂ سخن کا دَور چلتا۔ لوگ جرعہ ہائے شراب سے لے کر جرعہ ہائے رخسار تک سے لُطف اندوز ہوتے۔ میرن دہلی کا ایک رئیس زادہ تھا جو وزیر الملک کے مزاج میں دخیل ہو گیا تھا اس کا کام وزیر الملک کے لِئے خوش چہرہ لڑکوں کی فراہمی تھا۔ اس کے دلّال صبح و شام حسینوں کی ٹوہ میں رہتے اور خلوتِ شبینہ کے لِئے خُوبصورت لڑکے جمع کرتے، وزیر الملک نے اس شوق میں لاکھوں روپے صرف کِئے جس سے اُس کا محل خُوب صورت لڑکوں کی

جلوہ گاہ بنا ہوا تھا۔

محمد شاہ کے ہزاریوں میں کسل سنگھ ایک سردار تھا اُس کے نام پر کسل پورہ آباد تھا جہاں کسبیاں پیشہ کماتی تھیں۔

اربابِ نشاط میں نعمت خاں اور اُس کا بھائی موسیقی میں نازک سے نازک خیال ادا کرنے پر قادر تھے۔ غلام رسول اور جانی قوالی میں یکتائے روزگار تھے۔ باقر تنبورہ بجانے میں یگانہ تھا۔ خود بادشاہ اُس پر جی جان سے فدا تھا۔ حسن خان رباب بجاتے میں بے مثال تھا۔ غلام محمد سارنگی بجانے میں منفرد تھا، بڑے بڑے باکمال اُس کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کرتے تھے۔ قاسم علی، نعمت خاں کا شاگرد تھا۔ اُس کی آواز اور اس کے بھیرے میں زبردست کھچاؤ تھا معین الدین اور برہان الدین جاد و اثر قوال تھے گھانسی رام پکھاوج میں وحید العصر تھا۔ رحیم خاں کو خیال گاتے میں ملکہ حاصل تھا۔ شجاعت خان اپنی آواز کے بل پر بادشاہ تک رسائی رکھتا تھا۔ حسن خان ڈھولک بجانے میں بے نظیر تھا اور چھ ماہ تک نت نئی گت کے ساتھ ڈھولک بجا سکتا تھا جب اُس کی اُنگلیاں ڈھولک پر تیزی اور خوبصورتی سے چمکتیں تو معلوم ہوتا اندھیری رات میں جواہرات یا ستارے جگمگا رہے ہیں اور ارض وسما رقص میں ہیں۔ خواص اور الونٹا مشہور نقال تھے۔

سبزہ اور زمرد دو لونڈے لڑکے تھے۔ جب ناچتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے چمنستان متحرک ہیں۔

یہ تو مردوں کی خصوصیتیں تھیں۔ عورتوں کے احوال اس سے بھی سوا تھے۔

معشوقہ ابوالحسن، محمد شاہ کی محبوب رقاصہ تھی۔ آواز میں تمکنت لہجہ میں لوچ اور ادا میں رنگینی جو دیکھتا اُسی کا ہو رہتا۔ نور بائی ڈومنی تھی، لیکن فصیح گفتگو میں اس کا جواب نہ تھا اس کا مکان ایک مرجع دربار تھا۔ ہمیشہ ہاتھی پر سوار ہو کر سیر کو نکلتی چوب دار اور ملازم محافظ دستہ کی حیثیت میں ہمراہ ہوتے۔ جب اُمرا بلا بھیجتے تو قیمتی ہدیے بھیجتے۔ ایک دو نہیں بیسیوں رئیس اُس کے ہاں لُٹ گئے، اچھے اچھوں کی حویلیاں کھُد گئیں۔ اُس کی معیت میں بہت سی عورتیں ہوتی تھیں جنہیں بیگم اور خانم کہا جاتا تھا۔ ان سب کا فن روپیہ کھینچنا تھا اکثر قارونی جیبیں اُن کی بدولت خالی ہو چکی تھیں۔

امیر بیگم ایک عجیب الخلقت طوائف تھی، اس کا کمال یہ تھا کہ محفلوں میں برہنہ آتی ہر حصّہ عُریاں ہوتا۔ لیکن اس انداز میں پاجامے کی نقاشی کرواتی جیسے کمخواب کا بیلدار پاجامہ پہن رکھا ہو۔ اس عُریانی کو ہر کوئی پہچان نہ سکتا تھا تمام لوگ ملبّس ہی سمجھتے تھے۔ اعتماد الدولہ

کی داشتہ کا نام رآم رجنی تھا۔ زینت اور گلاب بڑے پایہ کی ڈیرہ داریاں تھیں، ان کے دروازے پر دستک دینا ہر کسی کے بس سے باہر تھا۔ رحمان بائی محض رقاصہ تھی، لیکن پیکرِ بدن ایسا تھا جیسے شام کشمیر مجسم ہوگئی ہو۔ پنا بائی کی آواز میں وہ سحر تھا کہ زندے تڑپ اٹھتے اور مُردے جی جاتے تھے، اُس نے بہت سی راگنیاں بھی تخلیق کی تھیں۔ پانی پر لکیر کھینچنا اور ہوا میں گرہ لگانا اُس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا، کمال بائی درباری مغنیہ تھی۔ کنورا بائی کی بیٹی کا نام اوما بائی تھا۔ اس کا دہن گلدستہ تھا جہاں اس کی ماں کا حسن ختم ہوتا، وہاں سے اُس کا حسن شروع ہوتا تھا۔ پنا اور ننو محمد شاہ کی منہ چڑھی طوائفیں تھیں۔ جب محمد شاہ نے نادر شاہ کی لوٹ سے دل برداشتہ ہوکر اربابِ نشاط کو چھٹی دے دی تو یہ دونوں بالاخانوں پر آ بیٹھیں جہاں ہر شب مغل شہزادے اپنی صبحِ انجام کو قریب لاتے تھے۔

ادھر ۱۸۵۷ء میں دہلی پر جو قیامت ٹوٹی اس سے پرانی ثقافت کے در و دیوار تک ہل گئے۔ تمام ملک بارہ باٹ ہوگیا وہ لوگ جن کے ہاں بادشاہوں کے دسترخوان بچھتے تھے اب روزی کی کسیبٹ میں مر رہے تھے۔ جنہوں نے کبھی کسی کا ہاتھ نہ تکا تھا اُن کے دامن کشکول ہوگئے اور اب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر پیٹ کی دُہائی دے رہے تھے، ادھر خاندانی شرافت فقیر کی گدڑی ہوگئی۔ ادھر ہر

کوئی بے نوا کاسونٹا بنا پھرتا تھا، جن چہروں پر دہلی و لکھنؤ کی شرافت کا انحصار تھا وہ تتر بتر ہو گئے۔ ہر شے پر جھوٹا جھول چڑھنے لگا۔ شرفا کی لاج لچوں کا قہقہہ بن گئی اور دیکھتی آنکھوں ایسا انقلاب برپا ہو گیا کہ تیمور و بابر کی بیٹیاں تن ڈھانپنے کے لئے چیتھڑے ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ تاریخ فحاشی شاہد ہے کہ کسبیوں کا وجود جنگ یا انقلاب کی کوکھ سے پیدا ہوتا پھر پنپتا اور بڑھتا ہے یونان اور روما کی تاریخ الفحشا۔ میں بھی اس کا اعتراف موجود ہے اور خود برصغیر ہندوستان کی تقسیم اس کی تازہ شہادت ہے۔ پچھلی دو بڑی جنگوں میں جو کچھ ہوتا رہا۔ وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ اس مادی تباہی سے قطع نظر جو یورپ میں اپنے خطرناک نتائج چھوڑ گئی۔ سب سے بڑا سانحہ وہ اخلاقی تباہی ہے جس سے عورت ایک جنس بن چکی ہے۔ پچھلی جنگ میں آسام کی سرحد پر ایک غیور قوم موگ نے قحط کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور جب بھوک کا تقاضا شدید ہو گیا تو موگ عورتوں نے اتحادی سپاہیوں کے ہاتھوں اپنا جوہر عصمت بیچ ڈالا۔ جو بہر حال روٹی کا بدل تھا —— روٹی —— اور —— عصمت ——!

۱۸۵۷ء کا سانحہ اپنے ساتھ یہی نتائج لایا تھا، جب تاج و تخت چھن گئے تو ان کی وابستگیاں بھی جاتی رہیں۔ معاشرہ کا معاشرہ تہس نہس ہو گیا۔ وہ رنڈیاں جن سے شرفا کے بچے آداب مجلس سیکھتے تھے شمع راہگذار ہو گئیں، جن کی زبان میں کوئی ہچکی نہ تھی۔ اس طرح اٹھتی گئیں کہ معیاری طوائف کا تصور

بتاشہ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کے برعکس بازاریوں میں حیرتناک اضافہ ہونے لگا اور وہ خرابیں جو اس پیشہ کے آداب سے ناواقف تھیں یہاں تک اُتار دی ہوگئیں کہ وہ جسم کو گوشت کے بھاؤ بیچنے لگیں۔ وضعداری کے تمام سانچے ٹوٹ گئے۔ مولانا شبلی کے ایک طنزیہ سوال پر سرسید نے کہا تھا۔ اُس زمانے کے لوگ واقعی اپنے دوست کی داشتہ کو بھاوج کی نظر سے دیکھتے تھے۔ خود طوائف کا یہ حال ہوتا تھا کہ جس سے ایک دفعہ تعلق ہو جاتا اُس سے عمر بھر ناطہ نہ ٹوٹتا۔

تھوڑے ہی دِنوں میں غدر کا ہنگامہ فرو ہو گیا اور استعمار انگریزی کی مصلحتوں نے ریاستوں کے وجود کو برقرار رکھا تو ریاستیں طوائفیت کی پشتیبان ہوگئیں چنانچہ غدر کے بعد طوائفوں کے ادارہ کو فروغ دینے میں سب سے نمایاں ہاتھ نوابوں، مہاراجوں، خانوں، تعلقداروں اور زمینداروں کا ہے۔ اس برِّعظیم میں طوائف کا موجودہ نظام براہ راست جاگیرداروں کی پیداوار ہے جو تکلّف، تصنّع، استحصال اور تلوّن، جاگیرداری نظام کی خلقی خصوصیّت ہے، وہی خصوصیّت ایک طوائف کی سیرت کا پرتو ہے۔

ہندوستان میں تقسیم سے پہلے ـــــ ۵۶۲ ریاستیں تھیں۔ سب سے بڑی حیدرآباد جہاں پونے دو کروڑ لوگ بستے تھے سب سے چھوٹی بلبآری جس کی آبادی صرف ۲۷ نفوس پر مشتمل تھی۔ ان سب ریاستوں کے رگ و ریشہ میں دالّا ماشاءاللہ، طوائف کا خون دَوڑتا رہا۔ ان میں سے بیشتر کے فرماں روا اپنے

اب وجد کی دُعا برکت سے طوائفوں ہی کی اولاد ہیں اور ان کا خمیر و ضمیر طوائف ہی کی مٹی میں گندھا ہوا ہے، یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ طوائف کا ادارہ جاگیرداروں ہی کی وجہ سے پروان چڑھا ہے۔ بڑی بڑی ریاستوں میں کسبیاں پلتی اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بکتی ہیں۔ ان ریاستوں کے گھناؤنے نظام کے باعث بردہ فروشی کو خاصا فروغ ہوا۔ مرحوم پنجاب میں چمبہ کا علاقہ خوبصورت لڑکیوں کی فروخت کے لئے بے حد مشہور تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ نے اپنے والد کی تین سو سے زائد بیویوں کو ۲۵ روپے فی نفر کے حساب سے فروخت کیا تھا، ہندوستان میں بہت سے راجے اور نواب ایسے تھے جو بیک وقت بیٹی اور ماں سے مستفید ہوتے رہے۔ خود مجھے ایک طوائف نے عند الملاقات بتایا کہ ریاستوں میں گورا رنگ اور سرمئی آنکھیں ہمیشہ راجواڑوں کی ملکیت سمجھی گئی۔ مشہور کہاوت ہے کہ:۔

"ریاستوں میں خوبصورت لڑکیاں ترقی حاصل کرنے کے لئے جنی جاتی ہیں"

ایک انگریز افسر نے جو ریاستی محکمہ میں کام کر چکا تھا اپنے ایک مراسلہ میں برطانوی حکومت کو لکھا تھا کہ ریاستی افسروں کا صرف ایک ہی کام ہے کہ وہ حکمرانوں کے لئے عورتیں اغوا کرتے ہیں۔

ایک مہارانی نے "بمبئی کرانیکل" میں رنواس کا کچا چٹھا لکھتے ہوئے اس

بات پر زور دیا تھا کہ:۔

"ہم محض بستروں کے کھلونے ہیں، ہماری زندگی یا موت کا انحصار مالکوں کی مرضی پر ہے۔ ہماری زندگی بھیانک خوابوں سے ابتر ہے ہمارے حرم مرصّع پنجرے ہیں جہاں ہمیں قید رکھا جاتا ہے۔"

چنانچہ راجپوتانہ کے ایک مہاراجہ اپنے پیچھے چار ہزار عورتیں چھوڑ کر مرے تھے اور ان میں بے شمار نابالغہ تھیں۔ اس شہوانی جذبے کی تسکین کے لیے ان حکمرانوں کے محلوں میں باقاعدہ عشرت کدے تعمیر ہوتے جن میں اس قسم کے آئینے آویزاں ہوتے تھے کہ ان سے اختلاط کے مختلف زاویوں کا لطف اُٹھایا جاتا تھا۔ مہاراجہ اندور کو محض اس جرم کی پاداش میں گدّی چھوڑنی پڑی کہ اُس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی داشتہ موراں کی پڑپوتی ممتاز سے تعلق قائم کیا، لیکن کچھ عرصہ بعد ممتاز کا دل اُچاٹ ہوگیا اور وہ بھاگ گئی۔ مہاراجہ کے ملازموں نے پیچھا کیا لیکن ممتاز نے بمبئی کے ایک کروڑ پتی سیٹھ باؤلے سے نکاح پڑھا لیا۔ مہاراجہ کے ملازموں نے موقع پا کر سیٹھ کو قتل کر ڈالا اور کوشش کی کہ ممتاز کو اُٹھا لیں مگر سب کے سب موقع پر گرفتار ہوگئے، مقدمہ چلا اور بالآخر مہاراج ادھیراج کا سنگھاسن ڈول گیا۔!

ان اللّے تللّوں کی بنیاد ہی پر ایک مصنّف نے کہا تھا:۔

"ہر انسان مختلف طریقوں سے دن کا آغاز کرتا ہے، انگریز انڈے

اور سوّر کے گوشت سے، جرمن ساسیج اور قیمہ سے، امریکن انگور
سے، مگر "ہز ہائی نس" دوشیزہ کو ترجیح دیتے ہیں۔!"

گوشت ہی گوشت

"اُبے لیتیماز رتشترا یہ گاہی (کبسی) ہے جو اپنے اندر مومنین و منکرین یعنی بُرے اور بھلے دونوں قسم کے آدمیوں کا بیج ملاتی ہے، اس کی نگاہ اس عظیم سیلاب کے پانی کو جو پہاڑوں سے آتا ہے ایک ثلث خشک کر دینی اور ایک ثلث طلائی پودوں کو مرجھا دیتی ہے، اس کے لمس سے مومن کے نیک خیالات، پسندیدہ اقوال، حسنہ اعمال، جسمانی قوت، قوائے فتح مندی اور رُوحانی تقدّس کا ایک تہائی خاک میں مِل جاتا ہے۔ (زرتشت پیغمبر)

لاہور کا موجُودہ چکلہ بوڑھے راوی کا ہم عمر ہے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانۂ انحطاط سے اس کا آغاز ہوتا ہے، اس سے بیشتر بازار چوک چکلہ سے رسالہ بازار تک جس میں نئی اور پُرانی انارکلی کا علاقہ شامل ہے کسبیاں بیٹھا کرتی تھیں اردگرد مغلوں کی سرکاری عمارتیں یا اُن کے کھنڈر تھے، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں شہر لاہور کا نصف چکلہ تھا۔ ممکن ہے رنڈیوں

کی اس مہمات کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ لاہور ہمیشہ ہی فوجوں کی گذرگاہ رہا، جب غیر ملکی حملہ آور خیبر پار سے ہندوستان میں داخل ہوتے تو اُن کا پہلا پڑاؤ لاہور ہوتا اس کے علاوہ سندھ، سرحد اور دہلی کے فوجیوں نے بھی لاہور کو جولانگاہ بنائے رکھا۔ ظاہر کہ جب کوئی شہر فوج کی زد میں ہو تو اُس کی دولت ہی نہیں عصمت بھی لٹتی ہے۔ فاتحین چکلے بناتے اور مفتوحین کسبیاں جنتے ہیں۔

برعظیم ہندوپاک کے چار بڑے چکلوں میں لاہور کا چکلہ چوتھے درجے پر تھا۔ بیس سال پہلے اقوام متحدہ کی ثقافتی کمیٹی نے مختلف ملکوں کی کسبیوں کے جو اعداد و شمار فراہم کئے تھے اُس کے مطابق اوّل کلکتہ تھا دوم بنگلور سوم بمبئی اور چہارم لاہور۔ تب کلکتہ میں ایک لاکھ سے زائد رنڈیاں تھیں اور اُن میں لگ بھگ پچانوے فی صد ٹکیائیاں تھیں۔ جس ادارہ کا نام طوائف ہے وہ یا تو لکھنؤ میں رہا یا آگرہ میں یا دہلی میں یا پھر لاہور میں۔

لاہور کا بازار عام بازاروں کے طرز پر نہیں، کئی بازاروں اور کئی محلوں کے وصل سے ایک بڑے قصبے کے برابر ہے، تمام علاقہ کو اجتماعاً ہیرا منڈی کہتے ہیں۔ اس کی سطح لاہور کے ہر حصہ سے بلند ہے اگر راوی کا پانی مارکرتا ہوا اس سطح تک آجائے تو نہ صرف لاہور غرق ہو جاتا بلکہ ملتان تک کا سارا علاقہ ڈوب جاتا ہے۔

ہیرا منڈی ایک تکون کی طرح ہے، عالمگیری مسجد اور اکبری قلعہ کے بائیں سمت بالاخانوں کی دُور تک پھیلی ہوئی ایک قطار ہے جس میں ٹیڑھی ترچھی کئی

قطاریں ختم ہوتی ہیں ٹکسالی دروازہ سے داخل ہوں تو سب سے پہلے نکڑ پر شاہی وقتوں کی ایک منزلہ مسجد ہے جس کے چہرے پر برص کے داغ ہیں ـــــ سیاہ دیواروں پر سفید دھبے ـــــ اس کی تعمیر مغلئی طرز پر ہے اس مسجد سے چند ہی قدم آگے رنڈیوں کے کوٹھے شروع ہو جاتے ہیں۔ بازار شیخو پوریاں کے وسط سے محلہ سمیاں کو جو راستہ جاتا ہے اس کی دو یا چار دکانیں چھوڑ کر ایک گلی مڑتی ہے جس کو ٹبی کہتے ہیں یہ ایک بازار نما کوچہ ہے جس کا دوسرا سرا بازار حکیماں کے آغاز پر ختم ہوتا ہے۔ ایک پہلو میں بازار جج عبداللطیف ہے دوسرا موڑ ٹبی تھانے کے ساتھ سے ہو کر گذرتا ہے۔ ٹھیک وسط میں گیٹی تھیٹر کا چوک ہے جہاں بازار شیخو پوریاں، چیت رام روڈ، شاہی محلہ، ہیرا منڈی، بارود خانہ کا مخفی حصہ اور اڈہ شہباز خاں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں۔

اس زہرہ گداز فضا کے صحیح تماشائی اورنگ زیب کی مسجد ـــــ یا کعبہ کی بیٹی کے وہ بلند قامت مینار ہیں جو سالہا سال سے انسان کی بیٹی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔

ٹبی ایک دندانہ دار کوچہ ہے اس کے اوپر نیچے دوکانیں اور مکان ہیں جہاں ہر رنگ اور ہر عمر کی عورتیں بھری پڑی ہیں[1]۔

---

[1] ملک امیر محمد خاں کی گورنری کے زمانہ میں عصمت فروشی قانوناً ممنوع ہو گئی تو یہ کوچہ بند ہو گیا نہ جانے اب صورت حال کیا ہے؟

یہ بازار نہیں، ایک سنگین بستر ہے، جہاں عورت کی عفت تھک کر ہمیشہ کی نیند سو گئی ہے۔ اس بوچڑ خانہ میں عورت قتل ہوتی ہے۔ اس کا گوشت بکتا ہے عورت کا گوشت ــــ میمنے کا گوشت ــــ دوشیزہ کا گوشت ــــ بڑہ کا گوشت ــــ باکرہ کا گوشت ــــ آہو کا گوشت ــــ ملیار کا گوشت ــــ گائے کا گوشت ــــ ہیر کا گوشت، سوہنی کا گوشت، صاحباں کا گوشت، سدا سہاگنوں کا گوشت۔ اُن سہاگنوں کا گوشت جو سہاگ رات ہی میں بیوہ ہو جاتی ہیں۔ کسی بھی گاہک کے لیئے کوئی قید نہیں ہر بوٹی کی قیمت مقرر ہے۔ آٹھ آنے سے تین روپے تک ــــ آپ نے دام پوچھا اور پھر جیسا گوشت چاہا خرید لیا تازہ، باسی، جوان، بوڑھا، سرخ، سفید، گوشت ہی گوشت جسم ہی جسم ۔ ؟

آپ کی چاندی اور عورت کی چمڑی، اس منڈی کا اصل الاصول ہے ہمیشہ دساور سے تازہ مال آتا کچھ دنوں ان دکانوں پر لٹکتا اور پھر باسی ہو جاتا ہے۔

بازار نہیں ــــ بوچڑ خانہ ــــ عورتیں نہیں ــــ بھیڑیں !!

اس پیچدار مارکیٹ میں کہیں اور کوئی سیدھا نہیں تمام بازار میں جوڑ ہی جوڑ ہیں، وسط میں ایک چھوٹا سا چوک ہے۔ غربی حصہ میں ایک کٹڑی ہے اور کٹڑی سے ایک طرف تکون موڑ ہے اس موڑ پر حضرت سید قاسم شاہ مشہدیؒ

کا مزار ہے۔ اس مزار کے پہلو میں مسجد ہے مسجد کے دروازے پر عموماً تالا پڑا رہتا ہے۔ متولی کا کہنا ہے کہ جو لوگ چوری چھپے آتے ہیں وہ حضرت سید قاسم شاہؒ کے مزار کی دیوار کا سہارا لے کر مسجد کے عقب سے نکل جاتے ہیں۔ لیکن بعض کھلنڈرے مسجد کی اہانت کو محسوس نہیں کرتے اور اسی کو چور دروازہ بنا لیتے ہیں۔

حضرت سید قاسمؒ شاہ رنجیت سنگھ کے ابتدائی زمانہ میں مشہد سے لاہور تشریف لائے تھے اور اس جگہ قیام فرمایا جہاں دفن ہیں۔ مزار کے پڑوس میں، ایک کھلے صحن کا مکان ہے جس کا چوبی دروازہ اندر سے بند رہتا ہے سید اولاد شاہ گیلانی ایم اے جو آپ کی پوتی کے بیٹے ہیں اس مکان میں رہتے ہیں۔ شاہ صاحب مدرس رہ چکے ہیں۔ تقریباً بیس سال تک ڈسٹرکٹ بورڈ ملتان میں سیکرٹری رہے۔ کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ٹبی اسم تصغیر ہے۔ ابتدا میں اس جگہ ٹبہ (ٹیلا) ہوتا تھا، حضرت قاسم شاہ نے اس کو اقامت و عبادت کے لئے چن لیا، مسجد کی نیو رکھی، حجرہ بنوایا اور یاد اللہ میں مشغول ہو گئے تھوڑے ہی دنوں میں ان کے فقر و استغنا کا چرچا ہو گیا۔

انہی دنوں چیچو کی ملیاں (شیخو پورہ) کے بعض خانہ بدوشوں نے ٹبی کے نشیب میں قیام کیا، یہ لوگ اپنے آپ کو پنجاب کی مختلف ذاتوں سے منسوب کرتے تھے۔ ان کا کام چٹائیاں بُننا اور چھتیں بنانا تھا۔ لیکن پیٹ کی مار صورتوں کے ساتھ سیر نہیں

بھی بگاڑ دیتی ہے ان کی عورتیں خوبصورت نہیں ان سے چوری چھپے پیشہ کمانا شروع کیا۔ حضرت قاسم شاہ کے فرزند حضرت میرن شاہ جو اس وقت دس گیارہ برس کی عمر میں تھے، اُن کی جھونپڑیوں میں شب کو گھس جاتے، دیئے گُل کرتے اور چلاتے :۔

سوّر آگئے سوّر، سوّر آگئے سوّر

اس پر چند لوگ حضرت قاسم شاہ کی خدمت میں پہنچے اور مرشد زادے کی شکایت کی، شاہ صاحب نے فرمایا :۔

میّرن! ان کے لیے دُعا کرو بد دُعا نہ دو سؤر بھی تو خدا کی مخلوق ہے ان خانہ بدوشوں ہی کی اولاد ہیرا منڈی کے پشتینی کنچنوں کی مورث ہے اور ان کی بڑی بڑی حویلیاں ہیں۔

جب حضرت میرن شاہ کا ۱۸۷۸ء میں وصال ہو گیا تو ٹبی کا نام کوچہ میرن شاہ رکھا گیا۔ لیکن ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں پولیس کے ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ علی گوہر نے اپنے نام سے منسوب کر لیا، وہ انتقال کر گیا تو کوچہ گاڈیاں کہلایا اب ٹبی یا چکلہ کہتے ہیں۔

ہر سال عرس کے موقع پر پشتینی رنڈیاں حضرت قاسم شاہ کے مزار پر حاضر ہوتی اور مجرا کرتی ہیں۔ انہی حضرت قاسم شاہ کے برادر زادے حضرت علامہ میر حسن سیالکوٹی۔ علامہ اقبالؒ کے اُستاد تھے علامہ میر حسن کے دو بیٹے تھے نقی شاہ اور تقی شاہ۔

نقی شاہ سے علامہ اقبالؒ کے دوستانہ مراسم تھے۔ "امروز" کے "اقبال نمبر" میں نقی شاہ کے نام علامہ اقبالؒ کے جس خط کا عکس چھپا تھا اُس میں امیر کا ذکر تھا، امیر ایک نامور طوائف ہوئی ہے۔!

ٹبی میں کوئی دوسو کے لگ بھگ دوکانیں، مکانیں[1] یا ڈرے ہیں جہاں سو تک کوئی چار ساڑھے چار سو کے قریب عورتیں بیٹھتی تھیں ان کا کام صرف جسم فروشی تھا کیونکہ عصمت نام کی کوئی چیز بھی وہاں نہ تھی۔ ان کی دوکانیں صبح بارہ بجے کھلتیں اور رات بارہ بجے بند ہو جاتیں۔ چونکہ یہ عورتیں بیگاری مال تھیں اس لئے ان کے ٹھیکیدار یا ان ٹھیکیداروں کے گماشتے سر پر کھڑے رہتے۔ نرخ اور ہوس باقی سب موقوف۔

عورتیں کیا؟ تاش کے پتے، چوسر کی نردیں، آم کی گٹھلیاں، کیلے کا چھلکا، خربوزے کی پھانک، گنے کی پوریں، سگریٹ کا دھواں، عورت نہیں شارع عام ان کا وجود ایک خوفناک قہقہہ تھا، ایک عریاں گالی، ایک سنگین احتجاج ایک اوپن ایر تھیٹر، ایک سرکاری کیبونک ــــ علماء سے معذرت کے ساتھ ایک عوامی شاہکار۔

---

[1] قواعد کی رُو سے مکان کی جمع مکانیں غلط ہے، لیکن مجھے اس میں ایک خوبی نظر آتی ہے۔

عورتیں نہیں ـــــ چتائیں   عورتیں نہیں ـــــ قبریں
عورتیں نہیں ـــــ آنسو ،   عورتیں نہیں ـــــ ہچکیاں
فطرت کے آنسو، انسان کے آنسو، عورت کے آنسو، خون کے آنسو،
آنسو ہی آنسو ـــــ ع
آدمی محسوس کرتا ہے خدا خاموش ہے

ٹبی سے باہر بازار شیخو پوریاں ہے ہیرا منڈی کے چوک تک پھیلی رنڈیوں کے مکان یا دُوکانیں ہیں۔ اس علاقہ کا سب سے بڑا چودھری سیالکوٹ کا ہے کوئی درجن ڈیڑھ درجن لڑکیاں اس کے تصرف میں ہیں، اس کی روزانہ آمدنی چار پانسو روپے ہو گی اس کے پاس رائفل ہے گولیاں ہیں کار ہے سواریاں ہیں تانگہ ہے گھوڑیاں ہیں دولت ہے، اثر ہے، رسوخ ہے، غرض سبھی کچھ ہے اس لئے کہ لڑکیاں ہیں۔

شاہی محلہ کی مختلف ٹکڑیوں میں یہ خانے ہی یہ خانے ہیں ایک طرف ڈینٹل ہسپتال کے نکڑ پر دوسری طرف شاہی مسجد کو نکلتے ہوئے چوک میں بہت سے نوجوان کھڑے رہتے ہیں، ان کا کام دلالی ہے، کاریں آتی گھُسر پھُسر ہوتی سودا چکتا اور جسم لے کر نکل جاتی ہیں۔

ہیرا منڈی کے چوک سے کوچہ شہباز خاں کے آخری سرے تک[1] بیٹھی کنچنیوں

---

[1] اب وہ بھی واصل جہنم ہو گیا ہے۔

کے مکانات ہیں۔ کچھ خاندانی رنڈیاں مدرسہ نعمانیہ کے آس پاس رہتی ہیں اکثر کھپ چکی ہیں۔ بعض کی اولاد بڑے بڑوں کے گھر میں اُٹھ گئی ہے اور بعض ابھی تک پُرانے ڈگر پر چل رہی ہیں۔

ہیرامنڈی اور ٹبی بازار میں بڑا فرق ہے، ٹبی محض قصاب خانہ ہے، ہیرامنڈی تصویر خانہ، ایک آرٹ گیلری جہاں راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں۔ اس علاقہ کے بالاخانوں میں دن ڈھلے قحبہ انگڑائیاں لے کر اُٹھ بیٹھتی ہیں رات کی پہلی کروٹ کے ساتھ ہی بازار جگمگانے لگتا ہے، کوئی نو بجے شب دروازے کُھل جاتے ہیں، ہر بیٹھک کی تیاری مکمل ہو چکتی ہے، ہر کوئی آ جا سکتا ہے لیکن ان بالاخانوں میں جانے کے لئے روپیہ اور ہمت کی ضرورت ہے کئی حویلیاں نسلی کنچنوں کی ہیں، یہ لوگ مالدار ہیں، ہر ایرا غیرا ان کے ہاں نہیں آ جا سکتا اُن کے ٹھاٹھ شاہانہ ہیں، اُن کے جسم شاہی کھلونا ہیں، اُن کی محلسرائیں جدید و قدیم کے امتزاج کا نمونہ ہیں ڈرائنگ روم ہیں، خاصہ خانے اور خلوت خانے ہیں، قالین ہیں، ڈوریوں سے کسے ہوئے پلنگ ہیں، فرش پر بچھی ہوئی ستھری چاندنی ہے، چاندی کے نقشی پاندان ہیں، پھولدار اُگالدان ہیں، مُغلئی حقّے ہیں، دیواروں پر جلی آئینے ہیں اور چھت گیریاں ہیں، وسط میں جھاڑ ہیں۔!

ایک طرف میراثی ساز لیے بیٹھے رہتے اور جب تک گاہک نہ آئیں تانا ریری کرتے، پھبتیاں کستے، لطیفے جھاڑتے اور حُقّے پیتے ہیں، ان کی شکلیں عجیب سی ہوتی

ہیں ہر کوئی گھُن لگا ایندھن ہے اکثر جواری ڈھنڈاری ہیں جو کچھ رات میں کماتے دن کو ہار دیتے ہیں، خرانٹ مُورت ہیں، چرکٹے ہیں، نٹ کھٹ ہیں، چپر غٹو ہیں، اَول جلول ہیں لیکن ہیں آٹھوں گانٹھ کمیت، انہیں رنڈیوں کے لاحقے اور سابقے کا نام دینا زیادہ بہتر ہے۔ عام گنوار نہیں انہیں اُستاد جی کہتی ہیں فطرت نے رنڈی کے چہرے سے حیا اور میراثی کے چہرے سے رونق دونو چھین رکھی ہیں۔

جب شوقین مزاج آتے ہیں تو یہ ایک نظر میں اُن کا جائزہ لیتے ہیں ان کا قیافہ عموماً درست ہوتا ہے کوئی مالدار ہو تو اُن کی آنکھیں شکرانہ پڑھتی نظر آتی ہیں ان کے چہروں کا اُتار چڑھاؤ گاہک کی جیب پر ہوتا ہے وزنی جیب، مرمریں جسم، طبلہ کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھُن چھُن، سارنگی کا لہرا، باجے کی کمک آواز کا شعلہ، غرضیکہ ہر شے سُروں میں گھُٹی ہوتی ہے، گاہک آتے اور جاتے ہیں جب کوئی آتا ہے تو کواڑ بند ہو جاتے ہیں، نہیں تو کھُلے رہتے ہیں۔ کواڑ کھُلے ہوں تو کسبیاں بھی کھُلی ہوتی ہیں، کچھ فلمی رسالے یا جنسی ناول پڑھتی ہیں، کچھ گاہکوں کی راہ تکتی ہیں کچھ سگریٹ سُلگا کر دھُوئیں کے مرغولوں میں ان اجنبی مردوں کا تصور باندھتی ہیں جو انہیں کھلونا سمجھتے اور جنہیں یہ کھلونا سمجھتی ہیں، لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی یاد کی ٹیسیں چھوڑ جاتے ہیں، ان کسبیوں کے والدین ان کے ساتھ رہتے اور کمائی کھاتے ہیں۔ فی الجملہ ان سے پُورا خاندان پلتا ہے۔

جب رات ذرا اور گہری ہو جاتی ہے تو شاہی محلہ کی اندھیری گپھاؤں

اور قلعہ کی سیڑھیوں کے نشیبی دورا ہہ پر طرح طرح کی کاریں آکر رُک جاتی ہیں، اور اُس وقت تک کھڑی رہتی ہیں جب تک عشق کے ساز لُوٹ نہیں جاتے اور حُسن کی موتیا کملا نہیں جاتی یا جب تک سوہنی کا جسم تھک نہیں جاتا اور مہینوال کی ہمّت ٹھٹھر کر یخ بستہ نہیں ہو جاتی۔ بعض کن رسیے محض دیوار کے سہارے کھڑے رہنے اور کبھی کبھار سایہ دیوار ہی میں ان کی رات بسر ہو جاتی ہے۔

اور جب ہر طرف بکھری ہوئی مسجدوں کے میناروں سے اَلصَّلوٰۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم کی آواز گونجتی ہے تو خانزادوں کی رنگا رنگ کاریں بھیروں میں سارے گاما پادھانی گاتے ہوئے بگٹٹ ہو جاتی ہیں اور اُن کے تعاقب میں کتّوں کے مُدھر گیت دُور تک چلے جاتے ہیں۔

سُورج جاگتا ہے قحبہ سو جاتی ہے اور اگر کچھ رہ جاتا ہے تو حکایتِ شبینہ کے غیر مرئی حروف جن سے چہروں پہ ایک تھکن سی ہوتی ہے۔

بازار کیا ہے لالہ زار ہے ہر شاخچہ کی کونپلیں شبنم سے نہیں سیم سے کھلتی ہیں، انہیں دن کی چمک سُلا دیتی اور رات کی کھنک جگا دیتی ہے۔ ان میں سے بعض عورتیں اناروں کے کُنج ہیں کہ دانہ دانہ پر مُہر لگی ہے، بعض انگوروں کا گُچھا ہیں کہ رندوں کا حلقہ نچوڑتا ہے، بعض گوؤں کا چونا ہیں کہ گوالے دُودھ دوہتے ہیں بعض کیلوں کی گہل ہیں کہ شوقین مزاج گودا کھا جاتے اور چھلکا پھینک دیتے ہیں، بعض روٹیوں کی تھئی ہیں کہ نفسی بھُوکے ٹوٹے پڑتے ہیں اور بعض پالنوں کی

ڈھولی ہیں کہ بانکے پتیاں چباتے اور چباتے ہی چلے جاتے ہیں۔
عورتیں نہیں، ساز کی دُھن، طبلہ کی تھاپ، رقص کا زاویہ، اور بستر کی تنہائی۔

دڑبے

گرم پانی کا پیالہ جو دوپہر کی تیز لُو میں کسی پیاسے کو دیا جاتا ہے۔
(عجمی شاعر)

چکلہ میں اُوپر نیچے ٹکیائیاں ہی ٹکیائیاں ہیں ـــــ سستی عورتیں جن کی دوکانیں دوپہر کو کُھلتی اور رات گئے بند ہو جاتی ہیں ـــــ بارہ بجے دن سے بارہ بجے رات تک ـــــ (یہ وقت پولیس کا مقرّر کیا ہوا ہے) اِدھر اُدھر لقندرے پھیرے پھاڑتے نظر آتے ہیں۔ شفق ڈھلتی ہے تو بازار کی چہل پہل بھی بڑھ جاتی ہے، تمام دوکانیں ہنڈولوں سے جگمگانے لگتی ہیں، کہیں سو کینڈل پاور کے بلب لٹکتے دکھائی دیتے ہیں اور کہیں سُرخ لالٹین نیکی کے دم واپسیں کی طرح جھلملاتی نظر آتی ہیں، بازار کا بھاؤ دو سے تین روپے تک ہے کہیں کوئی جسم آٹھ آنے میں بھی مل جاتا ہے۔ زیادہ تر اٹک پار کی عورتیں ہیں جو اکثر و بیشتر پشاوری حقّے کے کش لگاتی ہیں، پنجاب کی عورتیں لگاتار سگریٹ پیتی ہیں، جب رات اور بڑھ جاتی ہے تو ہر عمر کے تماشائی پلے پڑتے ہیں، ایک ہجوم در آتا ہے، کھیسے

سے کھو اچھلتا ہے ان کے قہقہے اور تماشائیوں کے آوازے، یا پھر اُن کے آوازے اور تماشائیوں کے قہقہے یکساں گونجتے ہیں کچھ منچلے گالیاں لڑھکاتے اور گالیاں کھاتے ہیں، ہر دریچہ کے باہر ٹھیکیدار یا اُن کا گماشتہ کھڑا رہتا یا ٹہلتا ہے جب سودا ہو چکتا ہے تو رقم گماشتہ لے لیتا ہے یا ٹکیائی اندر رکھی ہوئی بند صندوقچی میں ڈال دیتی ہے، تب دروازے پر کنڈی چڑھا دی جاتی ہے۔ گاہک پردے کے پیچھے تو شک پر چلا جاتا وہ بدنصیب بستر سے پہلے بخشش مانگتی ہے حسن کے زور پر جسم کی آڑ میں، اسلام و رسول کے نام پر، کوئی "خدا ترس" اُس کے ہاتھ میں چونّی یا اٹھنّی تھما دیتا ہے تو وہ تشکر کے لہجہ میں کہتی ہے دیکھیو! وہ خان جو باہر بیٹھا ہے اُس سے نہ کہنا مجھ سے چھین لے گا" اس مرحلے میں کبھی کبھار اُس کی عورت جاگ اٹھتی ہے اُس کی رُوح کے کھرنڈ کو کریدنے سے لہو کے جو ذرّے اُبھرتے ہیں ان میں کیا کچھ نہیں ہوتا؟ عورت ہوتی ہے، ماں ہوتی ہے، بہن ہوتی ہے، بیوی ہوتی ہے، بیٹی ہوتی ہے ـــــ ہونٹ ہلتے نہیں لیکن پکارتے ضرور ہیں ـ ؎

گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

خورشید نام کی ایک لڑکی اسی گلی میں اکہرے مکان کے چوبارے پر بیٹھتی ہے اُس کی ایک ہم نشین زمرد ہے دونوں کی عمر میں تھوڑا ہی فرق ہے خورشید کا رنگ ملیح ہے آنکھیں گول پلکیں لانبی قد میانہ ناک نقشہ تیکھا آواز کی اصل پنجابی

ہے لیکن لہجہ میں دہلی کا پیوند بھی لگا ہوا ہے، عموماً لٹھے کی شلوار اور پھولدار قمیص پہننی ہے کانوں میں سونے کی بالیاں جھلمل جھلمل کرتی ہیں، بظاہر کسی اچھے گھرانے کی "آبرو" معلوم ہوتی ہے لیکن زمانے کی ٹھوکر سے بے راہ ہوگئی ہے،
خورشید اور زمرد، دونوں ہمارے پاس آ بیٹھیں، خورشید نے چھٹتے ہی سوال کیا، "کہئے کیا حکم ہے"؛

"ہم سات ہیں"؛

"ہم دو ہیں"

"صرف تم؟"

"فی مہمان پانچ روپیہ ہوں گے کل ۳۵ روپے"۔

پینتیس روپے بہت زیادہ ہیں، فی نفر تین روپے؟

"ہونہہ" زینہ کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے، "آپ جا سکتے ہیں تین روپے میں تو مرغی بھی نہیں ملتی ہے"؛

ہم نے تکلفاً مڑنا چاہا اُس نے روک لیا۔

"چار روپے"

جی نہیں تین روپے

اُس نے سرد آہ کھینچی اور کہا اچھا تو نکالئے اکیس روپے"

ہم سب ٹھٹھر گئے اختر اور قاضی میرا منہ تکنے لگے قاضی کے رخساروں

پر لٹکتا ہوا گوشت اور بھی لٹک گیا۔ اُس نے عینک کے دبیز شیشوں پر کمخواب کی پٹی پھیرتے ہوئے دبلے الفاظ میں کہا۔

"۲۱ روپے"

وہ تاڑ گئی کہ خالی خولی جنٹلمین ہیں، اُس کے ہونٹ ایک غلیظ سا فقرہ لڑھکانے کے لئے مضطرب ہی تھے کہ اختر نے جیب سے دو سُرخے نکالے اور کہا "یہ لو بیس روپے ہم کچھ معلومات لینے آئے ہیں"۔ اس کے علاوہ ہمارا کوئی مقصد نہیں۔

"معلومات"

"جی ہاں"

"کیسی"

"یہی آپ کے پیشہ کے متعلق"؟

تو آپ صبح تشریف لائیے، اُس نے دس دس کے دو نوٹ مُٹھی میں بھینچتے ہوئے کہا آپ چاہیں تو یہ نوٹ واپس بھی لے سکتے ہیں۔

"نہیں، دن میں آنا مناسب نہیں۔ اس وقت ہر خصوصیت معلوم ہو سکتی ہے۔"

اُس نے ماتھے پر دو چار شکنیں ڈالیں کچھ سوچا اور کہا۔

"اچھا تو پوچھئے آپ کیا چاہتے ہیں"۔

"تمہارا نام"

"خورشید"

"گھر کہاں ہے"

"جہاں آپ دیکھ رہے ہیں"

"ہمارا مطلب ماں باپ کے گھر سے ہے"

"یہ نہ پوچھئے، اس بازار کی کوئی عورت بھی اپنا صحیح پتہ بتانے کو تیار نہ ہوگی"۔ ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے "بھلا یہاں عورتیں کہاں؛ یہ سب جسم ہیں یا گالی! جو عورتیں بہ اصرار اپنا نام یا پتہ بتاتی ہیں وہ فریب دیتی ہیں سب جھوٹ ہوتا ہے۔

ایک ملے جلے سوال کے جواب میں اس نے کہا،

"غور سے دیکھئے یہ سب مکان نہیں دڑبے ہیں ایک چھوٹے سے حجم کے دڑبہ کا کرایہ بھی سو سوا سو سے کیا کم ہے، شہر میں ایسا مکان پانچ یا چھ روپے ماہانہ پہ مل جاتا ہے لیکن اس ننکا میں ہر کوئی باون گز کا ہے، مالک کا منشی ہر روز کرایہ وصول لیتا ہے، تمام گلی کے مکان تین یا چار افراد کی ملکیت ہیں، ان کی ہزارہا روپیہ ماہوار آمدنی ہے، جو عورت روزانہ کرایہ نہ دے سکے اس کا سامان بلا توقف باہر پھینک دیا جاتا ہے کئی لوگ پگڑی دینے کو تیار رہتے ہیں چونکہ آجکل کساد بازاری ہے اس لئے بعض دڑبوں میں دو دو چار چار بیٹھتی اور گزر کرتی ہیں، اکثر ٹھیکیداروں کی مملوکہ ہیں اُن کا معاملہ دو نفظی ہے جب تک ان کے جسم کی مانگ

رہے وہ ٹھیکیداروں کی دولت میں تواتر سے اضافہ کرتی چلی جاتی ہیں جسم ڈھلتے ہی ٹھیکیدار نکال دیتے ہیں، وہ دیکھئے سامنے ایک ڈھلے ہوئے جسم کی کل بری لوہے کی کرسی پر بیٹھی ہے اس نے اپنے مالک کے قحبہ خانے کی بنیاد رکھی جوانی بھر کما کر دیتی رہی، اسی کی کمائی سے اُس نے گوشت پوشت کے بعض کھلونے خریدے ہیں پرسوں ہی اُس نے مالک سے کہا گرمی زیادہ ہے، مجھے بھی ایک پنکھا لے دو، اُس نے گالی لڑھکاتے ہوئے کہا یہ مُنہ اور مسور کی دال تین روپلے روز اڈے کا کرایہ آٹھ آنے کی بجلی آٹھ آنے پنکھے کے ڈیڑھ روپے روز کی روٹی اور پھر کپڑا لتا اب کماتی کیا ہو، کبھی چار اور کبھی پانچ۔ اُس نے اصرار کیا تو اس بُری طرح پیٹا کہ پناہ بخدا وہ چاہتا ہے یہ چلی جائے تو اس کی جگہ ایک اور جوان جسم آسکتا ہے۔

"تو یہ چلی کیوں نہیں جاتی"۔۔۔ اختر نے سوال کیا

کہاں جائے؟ اب ہڈیوں کا خول ہی تو ہے آپ نہیں جانتے ایک کسبی کا بڑھاپا بڑا ہی ویران ہوتا ہے۔

وہ دیکھئے، اس طرف ایک معمر عورت مونڈھے پر بیٹھی ہے۔ اس کی کہانی بھی اس سے مختلف نہیں اب چار و ناچار "آزاد" ہے۔ بڑی مشکل سے دو چار روپیہ پیدا کرتی ہوگی۔ اس نے دو چھوٹی چھوٹی بچیاں خرید رکھی ہیں جنہیں بھائی کی بیٹیاں بتاتی ہے، خود گور کنارے آگئی ہے لیکن اس کے باوجود ان

کی جوانی کے تصور سے مطمئن ہے۔

آخر یہ سب لڑکیاں کہاں سے آتی ہیں۔

اس نے زور کا ایک قہقہہ لگایا پھر بات اُٹھاتے ہوئے کہا۔

اس گلی میں اس وقت کوئی چار سو کے لگ بھگ لڑکیاں ہوں گی، آتی کہاں سے ہیں؟ سُنیئے!

کوئی دو ڈھائی سو تو سرحد کے ٹھیکیداروں کی ملکیت ہیں جو سرحد ہی کے مضافات سے خرید کی گئی ہیں، ان میں سے بعض کو ان کے والدین روپیہ لے کر بیاہ دیتے اور "مصنوعی" خاوند انہیں یہاں لا بٹھاتے ہیں، کئی بردہ فروشوں سے مول لی گئی ہیں، ان بردہ فروشوں کی کڑیاں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں، جب کوئی عورت ایک چکلہ میں خاصی ہتھے چڑھ جاتی ہے تو پھر اُس کو دوسرے شہر کے لیے بیچ دیا جاتا ہے جو عورتیں اپنے طور پر بیٹھی ہیں اُن کی حیثیتیں مختلف ہیں مثلاً بعض یتیم خانوں سے اغوا کی گئی ہیں، بعض کے والدین بیچ جاتے ہیں، بعض سوتیلی ماں کے سلوک سے تنگ آ کر بھاگ آتی ہیں، بعض کو جنسی لذت لے آتی ہے، بعض کے آشنا دغا دے جاتے ہیں، بعض کا مسئلہ صرف پیٹ کا ہے اور اب بیسیوں "مہاجرہ" ہیں۔

"کیا انہیں اس زندگی سے گھن نہیں آتی؟"

"ضرور آتی ہے لیکن مجبور ہیں۔"

"کیا مجبوری ہے؟"

اس نے پھر زنّاٹے کا ایک قہقہہ لگایا اور زمرّد سے کہا، سمندر کو آواز دو چینک چائے لے آئے۔

مجبوری ڈھکی چھپی نہیں جو مالکوں کی قید میں ہیں، وہ بے بس ہیں، انہیں یقین ہو چکا ہے کہ ان کے متموّل مالکوں کا کچھ نہیں بگڑ سکتا وہ انہیں مجازی خدا سمجھتی ہیں۔

عورت اور روپیہ طاقت ور سفارش ہیں، اُن کے سامنے قانون اور انصاف بھی گھٹنے ٹیک دیتے ہیں، ان بدنصیبوں میں سے بعض کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ چکلے کے باہر کوئی اور دُنیا بھی ہے، یہ گاؤں کی لڑکیاں لاہور کو بھی گاؤں ہی سمجھتی ہیں، اُن کے نزدیک ساری دُنیا ایک چکلہ ہے اور یہ اس چکلے کی ایک فرد۔ پھر ایک کسی کی فریاد سُنتا کون ہے دُنیا مردوں کی ہے اور ان کے مالک مرد ہیں، دُنیا دَولت والوں کی ہے اور اُن کے آقا دَولت والے ہیں، فرض کیجئے یہاں سے بھاگ جائیں تو جائیں کہاں؟ کیا کوئی مرد بستر بنائے بغیر عورت کو سہارا دینے کے لئے تیّار ہے۔

"اور یہ جو خود بیٹھی ہیں ان کی مجبوری کیا ہے؟"

آپ ٹھیک کہتے ہیں بظاہر کوئی مجبوری نہیں یہ جا بھی سکتی ہیں لیکن ان سے احساس زیاں جاتا رہا ہے، ان کی عادتیں پختہ ہو کر ان کی فطرت بن چکی ہیں پس منظر

میں ایک ۔تو پیٹ کا مسئلہ ہے دوسرے ان کی عادتیں اتنی خراب ہو چکی ہیں کہ اس ماحول سے نکلتے ہوئے گھبراتی ہیں جب وہ اس ٹھکانہ پر آ بیٹھتی ہیں تو اُن کے لئے کوئی دوسرا ٹھکانہ باقی نہیں رہتا۔

"کیا انہیں ماں باپ کا خیال آتا ہے"؟

وہ چُپ ہو گئی لیکن زمرد نے چائے کی پیالیاں پیش کرتے ہوئے کہا آپ کا سوال احمقانہ ہے! عورت کا دل بڑا ہی نرم و نازک ہے ہر بیٹی ماں کی گود کو ضرور یاد کرتی ہے"، خورشید کا چہرہ اشکبار ہو گیا اُس نے پلّو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

اس سوال کا تعلق دماغ سے نہیں دل سے ہے۔

"آپ کسی کے عقد میں کیوں نہیں چلی جاتیں"؟

"عقد تو روز ہوتا ہے لیکن ہر عقد کے ساتھ ہی طلاق بھی ہو جاتی ہے"۔

معاف کیجئے مردوں میں شادی کی خواہش بستر تک ہی رہتی ہے جب خُون کی حرارت ٹھنڈی ہو جاتی ہے تو پھر شادی کا خیال بھی اُڑ جاتا ہے۔

"کیا آپ کو لائسنس لینا پڑتا ہے"؟

"جی نہیں تھانے میں رپٹ لکھوا دی جاتی ہے"۔

"کوئی ٹیکس وغیرہ"؟

"پیشہ کا ٹیکس تو کوئی نہیں ویسے کئی ٹیکس ہیں"۔

مثلاً

یہ مثلاً نہ پوچھئے۔ اس مثلاً میں بڑے خطرے ہیں؟ مثلاً مرد کی بیگار اُس کی محنت ہے" اور عورت کی بیگار اُس کی عصمت۔!

کیا یہ صحیح ہے کہ کارپوریشن کے ڈاکٹر ہر مہینے معائنہ کرتے ہیں۔

"جی ہاں ہر مہینہ تو نہیں، لیکن سہ ماہی ششماہی چلے آتے ہیں"۔

"مشہور ہے کہ مہلک مردانہ امراض ان گھروں ہی سے تقسیم ہوتے ہیں"۔

"ہو سکتا ہے بعض عورتیں مریضہ ہوں، لیکن جو کچھ مرد دے جاتے ہیں وہی لے جاتے ہیں، اس قسم کے مرض عورت کا مرد سے صحیح انتقام ہیں"۔

"تمہاری آمدنی کیا ہے"؟

"یہ ایک کاروباری راز ہے"!

"ان عورتوں کی آمدنی کیا ہوگی"؟

"ہر عورت کی آمدنی مختلف ہے بعض دن میں سَو بھی کما لیتی ہیں۔ بعض پچاس بعض چالیس بعض دس پندرہ اور بعض چوبیس گھنٹے میں دو چار سے آگے نہیں بڑھتیں کئی معمریں کئی کئی روز کچھ نہیں کماتیں آجکل ویسے ہی مندا ہے"۔

"اور یہ جو ٹھیکیداروں کے قبضہ میں ہوتی ہیں انہیں کیا ملتا ہے"؟

"روٹی کپڑا"۔

"اس کے علاوہ"؟

"اس کے علاوہ دھول دھپّا، گالی گلوچ، باور کیجئے ان میں سے اکثر نے یہ پاس کی شاہی مسجد کے مینار تک نہیں دیکھے ہیں، شہر کا تو ذکر ہی کیا ہے"۔

"تو گویا یہ عورتیں نہیں ہیں"؟

"جی ہاں کِھلونے ہیں دلچسپ کھلونے، جن سے کائنات کی ہر شے کھیلتی ہے"۔

"کیا سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں آپ کوئی چھٹی بھی مناتی ہیں"؟

"عاشورہ کے دس دن"

"اور عید، شبرات۔"

"یہ تو ہماری کمائی کے دن ہوتے ہیں"۔

"رمضان المبارک میں"؟

"ہمارا کاروبار رات کو شروع ہوتا ہے اور روزہ کا تعلق دن سے ہے"۔

"آپ کو عاشورہ سے کیا تعلق ہے"؟

"حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شہادت کے دن ہیں اور ہم مذہباً ان دِنوں کا احترام کرتی ہیں"۔

"کیا تمہیں مذہب سے دلچسپی ہے"؟

"کیوں نہیں؟ ہم بھی بفضلہ تعالیٰ مسلمان ہیں یہ ٹھیک ہے کہ ہم گنہگار ہیں لیکن خُدا کی رحمت کے دروازے تو ہم پر بند نہیں سب بہنیں پیر فقیر مناتی ہیں

نذر نیاز دیتی ہیں مزاروں پر چڑھاوے چڑھاتی ہیں، خانقاہوں کے سلام کو جاتی ہیں، عاشورہ کے دنوں میں ماتم کرتی ہیں تعزیہ نکالتی ہیں علم اُٹھاتی ہیں"۔

میں نے جائزہ لیا تو اُس کا مکان دڑبہ نہیں تھا دو کمرے تھے۔ پہلا کمرہ "انتظاریہ" تھا جہاں وہ کرسی پر بیٹھی گاہکوں کی راہ تکتی ہیں دوسرا کمرہ خلوت خانہ تھا جہاں ایک چوبی پلنگ پڑا تھا، اس پر ایک توشک تھی اور توشک پر سفید چادر، پلنگ کے چوکھٹوں میں دو ننگی تصویریں جڑی ہوئی تھیں، اُوپر دیوار پر اخباروں کے تصویری تراشے لئی سے چسپاں تھے ثریا، کامنی، نرگس، نمی صبیحہ اور نورجہاں کے فوٹو فریم کئے ہوئے تھے، ایک کونے میں جستی حمام پڑا تھا، اس کے پہلو میں مٹی کا گھڑا اور مٹی کا لوٹا رکھا تھا غالباً شہتیروں کی بدنمائی کو چھپانے کے لئے اخباروں کے پرزے چھت میں چپکا دیئے گئے تھے ——— یعنی خبریں سرخیاں دلچسپ عبارتیں:۔

حکومت پاکستان چکلے اُٹھا دینے کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے، زمیندار

"چٹان" کو فحاشی کے الزام میں بند کر کے حکومت نے مستحسن قدم اُٹھایا ہے۔ آفاق

پاکستان کا دستور شرعی بنیادوں پر بنایا جا رہا ہے، سید سلیمان ندوی کی توضیحات۔ احسان

بیڈن روڈ پر ایک نوجوان عطاء الرحمٰن نے خودکشی کر لی، وہ کئی

روز سے بھوکا تھا۔ امروز

مجھے عصمت فروشی کے لئے مجبور کیا جاتا رہا ہے، عدالت میں حُسن بانو کا بیان۔ نوائے وقت

یہ حکومت غیر اسلامی بنیادوں پر قائم ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تصریحات۔ تسنیم

نیلم کی کہانی

ایک مقفیٰ نظم میں اتنی دلکشی نہیں ہوتی جتنی دلکشی ایک معرّیٰ عورت میں پائی جاتی ہے (چینی مصنف)

غور سے دیکھا تو نیلم کے چہرے پر ابھی تک عورت کا رُوپ تھا پہلے اُس کا مکان چیت رام روڈ پر تھا اب بازار شیخو پوریاں میں ہے ان پانچ سالوں میں اُس پر مصیبت کی ایک پُوری کہانی بیت چکی ہے اب وہ ایک خرانٹ عورت ہے اس کا مکان بہت سی نو واردوں کا اڈّہ ہے وہ اُن کی مالکن ہے وہ اُن کی معلّمہ ہے وہ اُن کی آپا ہے وہ ایک داستان گو ہے لیکن خود بھی ایک سرگزشت ہے اب اُس کا گورا رنگ مدھم ہو چکا ہے اُس کی چپٹی ناک اور بھی بیٹھ گئی ہے وہ میانہ قامت ہے، لیکن بالا بلندوں سے شانے ملاتی ہے اُس کی آنکھوں میں مضمحل سا رَس ہے لیکن ڈورے سرمئی ہیں اُس کے یاقُوتی ہونٹوں پر بہت سی کانٹیں ہیں جن سے اَن گنت تماشائیوں کی شب بسری کا سُراغ ملتا ہے اس کا لہجہ بے وقار ہونے کے باوجود خنک ہے اس کی زندگی کئی مخاصمتوں اور

مفاہمتوں کا سنگم ہے وہ ان عورتوں کا صحیح نمونہ ہے جن میں اُفتادِ زمانہ سے کئی عورتوں کی خصوصیتیں جمع ہو جاتی ہیں حرآفہ کا شہدپن —— رنڈی کا فحش —— نائکہ کا تجربہ اور مدخولہ کی سینہ زوری۔

"آپ اس بازار میں کہانیاں جمع کر رہے ہیں؟" اُس نے کہا —— "مشغلہ تو اچھا ہے لیکن آپ اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے جتنی بھی عورتیں اس بازار میں ہیں سب ایک ہی ٹہنی کی پتیاں ہیں۔ سب کا درد یکساں ہے سب کی کہانی ایک سی ہے، سب خوش ہیں سب ناخوش، سب عورتیں ہیں اور کوئی بھی عورت نہیں۔ بھلا وہ عورت عورت رہ جاتی ہے جس کی آبرو کے دروازے پر ہر کوئی دستک دے سکتا ہو جس کی کوئی سی رات بھی اپنی نہ ہو اور جس کا بستر کرایہ کی چیز ہو —— ہاں! آپ میری کہانی پوچھنا چاہتے ہیں تو سُنیئے —— یہ اس عورت کی کہانی ہے جو سب کچھ ہار چکی ہے"۔

"میرے والد پٹیالے میں اپنے گاؤں کے نمبردار تھے ان کا نام شیخ عطا محمد ہے وہ تین سو بیگھے بارانی اور تین سو پینسٹھ بیگھے نہری زمین کے مالک تھے، جب بٹوارہ ہو گیا تو ہمیں گاؤں چھوڑنا پڑا ریاست نے مسلمان پناہ گزینوں کے لئے بہادر گڑھ کیمپ جاری کر رکھا تھا سارا کنبہ وہیں پہنچ گیا ہزارہا لوگ تھے بٹوارہ کیا تھا ایک زلزلہ تھا۔ چاروں طرف خون ہی خون تھا۔ ہندو صرّافوں نے لاکھوں روپے کا سونا تینتیس روپے تولہ کے حساب سے خرید کیا، مہاراج کے

فوجی صبح و شام کیمپ کا چکر لگاتے جو عورت پسند ہوتی اُٹھا کر لے جاتے۔"

اس پر اُس کی آواز کسی قدر روندھ گئی ——" اکالی دل نہیں ٹڈی دل —— انسانی آبرو کو بُری طرح اُجاڑ رہا تھا۔ ہزارہا مسلمان بے حس دھاتوں کی طرح تھے باپ اور بھائی کے سامنے اُن کی بیٹی اور بہن کو ٹٹولا جاتا حکم ہوتا نقابیں اُلٹ دو سو رما لڑکیاں چُن لیتے گویا لڑکیاں نہیں جانیں ہیں کوئی قانون اور انصاف نہ تھا۔ بیس روپے سیر آٹا۔ دو آنے میں پانی کا گلاس اور چالیس روپے سیر نمک۔"

"تم پر کیا بیتی —— ؟"

"ہم پر —— ماں نے تو کیمپ ہی میں دم توڑ دیا والد کی عمر اسی برس کی ہے اور ہمیں اس حالت میں دیکھنے سے پہلے ہی اندھے ہو چکے ہیں ہم کُل آٹھ جی ہیں بڑی بہن، چھوٹی بہن، بھتیجی، تین چھوٹے بھائی باپ اور میں سب کا بوجھ میرے کندھوں پر ہے۔"

"تمہارے" ؟

"جی ہاں"

"اور تم یہاں کیسے آئی ہو" ؟

"پاکستان تک تو خدا لایا تھا، اِس بازار میں پیٹ لے آیا ہے۔"

"کیا تمہارا سورماؤں کے ہاتھ سے بچ نکلنا معجزہ نہیں" ؟

"جی ہاں —— وہ تو میں نے عرض کیا ناکہ خدا لے آیا ہے خان لیاقت علیخاں

کی بدولت سپیشل ٹرین کا انتظام ہو گیا اور ہم شاہدرہ پہنچ گئے۔"

"پھر کیا ہوا"

"ہوتا کیا؟ کئی روز تک وہاں کھلے میدان میں پڑے رہے۔ پھر ادھیڑ عمر کے ایک شخص نے دستگیری کی اور خدا ترسی (اس پر وہ ذرا مسکرائی) کے جذبے میں گھر لے گیا۔ اُس کا مکان انار کلی میں تھا۔ ہمیں چھینٹ کے کپڑے سلوا دیئے۔ اس کی باتوں میں شہد تھا۔ والد مکان وغیرہ الاٹ کرانے کی فکر میں تھے ہمارا یہ اجنبی مددگار درخواستیں لے جاتا لیکن بے سود۔ تیسرے چوتھے روز ایک عورت نے آنا شروع کیا اُس کا نام گلزار تھا پہلے اکیلی آتی رہی، پھر اُس کے ساتھ کچھ جوان لڑکیاں آنے لگیں۔ تمام ریشمی کپڑوں اور سونے کے زیورات میں لدی پھندی ہوتیں ایک دن اُس نے مجھے بہکانا شروع کیا۔"

"دیکھو تمہارا باپ اندھا ہو گیا اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے غیر کب تک روٹی کھلائے گا۔ — گانا سیکھ لو اس میں کوئی برائی بھی نہیں — ایک آرٹ ہے خدا مسبّب الاسباب ہے اس طرح روٹی کی فکر سے آزاد ہو جاؤ گی۔" یہ میرے لئے ایک نیا مرحلہ تھا۔ میرا انگ انگ کانپ گیا کئی خوف میرے سامنے آ گئے خدا کا خوف، ضمیر کا خوف، انسان کا خوف، باپ کا خوف اور اس ماں کی قبر کا خوف، جس کی چھاتی سے ہم نے دودھ پیا تھا گلزار گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے تھی اُدھر اُس کی چکنی چپڑی باتیں تھیں اِدھر ہمارا پیٹ خالی تھا، سوچا دل نہ

مانا۔ انکار کیا تو اس کا اصرار بڑھا —— وہ شخص جو ہمیں اس مکان میں لایا تھا کئی روز سے غائب تھا۔

گلزار نے دیکھا سیدھی اُنگلیوں سے گھی نہیں نکلتا تو مطالبہ کیا تم پر اب تک آٹھ سو روپیہ خرچ ہو چکا ہے ادا کرو اور چلی جاؤ۔ اُس کا یہ کہنا تھا کہ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی مرتا کیا نہ کرتا آخر اس بازار میں پہنچ گئے۔ اگلی صبح اُستاد جی آ براجے۔ تعلیم شروع ہو گئی۔ آواز میں لوچ تھا ہی اب ترتیب پا گیا اور ناچنا کچھ تو اس فضا سے سیکھا کچھ فلموں سے۔ تھوڑے ہی دنوں میں آواز کی آڑ میں جسم کا چرچا ہو گیا۔ آپ یقین کیجئے میں نے ضمیر کی ایک ادنیٰ سی گھبراہٹ کے بعد اپنا جسم بیچ ڈالا اب ہم دونوں بہنیں بازار کا مال تھیں۔"

"تمہارا دل اس سے متنفر نہ ہوا؟"

"کیوں نہیں ؟ لیکن یہ ماحول ہی ایسا ہے کہ جب کوئی آدمی کسی نہ کسی طرح یہاں آ پہنچتا ہے تو پھر یہیں کا ہو جاتا ہے۔"

"کیا پٹیالہ میں تمہارا نکاح ہو چکا تھا؟"

"جی ہاں! میری بہن نے خود طلاق حاصل کی اور مجھے طلاق مل گئی تھی۔"

"کیا وجہ ہوئی ؟"

"یہ خاندانی جھگڑے کچھ عجیب سے ہوتے ہیں، ان کے ذکر سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

"اچھا تم نے کچھ راگ بھی سیکھے ہیں؟"

" صرف ایک راگ جس کا کوئی نام نہیں —— اور گانے والیاں تو اس بازار میں دو چار ہی ہوں گی، ہمارا کام تو صرف خوش وقتی ہے"۔

"گلزار نے تمہیں کیا دیا؟"

"مجھے اور میرے متعلقین کو روٹی کپڑا۔"

"اور تم نے اُس کو کیا دیا؟"

"میں نے اور غفوّرن نے دیہ بھی ایک بے سہارا پناہ گزین لڑکی ہے، اس کو ایک سال میں چالیس ہزار سے زائد روپیہ کما کر دیا جس سے وہ ایک عالیشان بلڈنگ خرید چکی ہے۔"

"اب کہاں ہے وہ؟"

"اسی بازار میں ہے اور کئی لڑکیوں کی مالکن ہے مجھ پر جب اُس کا جبر بڑھا تو مَیں نے ایک آدمی کے مشورے سے علیحدہ کاروبار شروع کیا۔ یہ دو کمرے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کرایہ پر لے رکھے ہیں۔ خُدا کے فضل سے اچھّے دن گزُر رہے ہیں"۔

"خُدا کا فضل —— ؟"

"کیوں آپ کو اس پر تعجّب ہے؟ خُدا کا فضل نہ ہو تو ہمارے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں، ہر کوئی ہمیں خانگی کہہ کر پُکارتا اور مویشی سمجھ کر ہنکارتا ہے ہماری

عزت یا محبت صرف بستر تک ہے، اس کے سوا کوئی عزت نہیں"۔

"تو آپ لوگ یہ پیشہ ترک کر دیں"؟

"ہم تیار ہیں لیکن جائیں کہاں اور قبول کے کون؟ لوگ کھیلتے ہیں بیاہتے نہیں، کئی دفعہ اخباروں نے چکلے اٹھا دینے کا شور برپا کیا ہے، لیکن ہوتا ہوانا کچھ نہیں، جو اٹھانے والے ہیں وہ راتوں کو چوری چھپے آتے ہیں اور جو شور مچا رہے ہیں وہ صرف اس لئے کہ انگور کھٹے ہیں کس کا جی چاہتا ہے کہ شارع عام بنے اور لحظہ بہ لحظہ بکتی رہے، عورت نہ ہوئی اخبار ہو گیا"۔

"لیکن حکومت پر زور تو دیا جا رہا ہے"۔

وہ کھکھلا کر ہنس پڑی —— "آپ بھی انجان بنتے ہیں حکومت کے لئے اور تھوڑے کام ہیں، یہ ایک اخلاقی مسئلہ ہے اور اس کا تعلق پورے معاشرہ سے ہے"

"لیکن حکومت کے بھی تو کچھ فرائض ہوتے ہیں"؟

"جی ہاں! کیوں نہیں؟ وہ اپنے فرائض کو بڑی خوبی سے پورا کرتی ہے مثلاً" ایک دفعہ قلعہ کی سیڑھیوں پر لیاقت علی خاں نے سلامی لی تھی تو قلعہ کی سیڑھیوں پر جو قالین بچھائے گئے تھے ہمارے ہی مکانوں سے گئے تھے جب کبھی قلعہ سے باہر یا قلعہ کے اندر کوئی سرکاری تقریب ہوتی ہے قالین ہمارے ہاں ہی سے جاتے ہیں"۔

"اوہو! یہ تو ایک خبر ہے"۔

"خبر کیسی، راعی کا رعایا پر حق ہوتا ہے ہمیں تو سرکاری ڈنگل کے لئے بھی ٹکٹ خریدنے پڑتے ہیں۔"

"آپ لوگ انکار کیوں نہیں کر دیتے۔"

"خوب! آپ بھی ہوا میں گرہ لگا رہے ہیں۔ تو بعض اوقات تھانیدار کے مہمانوں کے لئے بستر بھیجنے پڑتے ہیں، ایسا نہ کریں تو ہمارا کاروبار ایک دن میں ٹھپ ہو جائے۔ ہم لوگ عیبوں کی گٹھڑی ہیں جو شخص بھی یہاں آتا ہے وہ اخلاقی چور ہوتا ہے پولیس سے جھگڑا مول لے کر بھوکوں مرنے والی بات ہے بلکہ قید ہونے والی۔"

"تم بیاہ کیوں نہیں کر لیتیں۔"

"مجھ سے اور میرے جسم سے تو بیاہ کرنے والے کئی ہیں۔ نہ بھی ہوں تو پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن میرے بوڑھے باپ اور ناچار کنبہ کی ذمہ داری کوئی نہیں لیتا ایک دفعہ ایک مقامی بنک کا منیجر مجھے گھر لے گیا لیکن دوسرے ہی مہینے اکتا گیا مجھے رکھنے کے لئے تیار تھا گھر والوں کو نہیں اور اب تو میں بیاہ کے لفظ ہی کو مذاق سمجھتی ہوں۔"

"اچھا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"

"محبت ——" وہ ایک گہری سوچ میں ڈوب گئی پھر یکا یک بولی۔

"کبھی نہیں اور بالکل نہیں۔ محبت ایک فضول چیز ہے۔ اس سے معزز

خاندانوں کی کنواریوں کو تو دھوکا دیا جا سکتا ہے ہمیں نہیں، ہم دوکاندار ہیں دوکاندار کا کام گاہک سے محبت کرنا نہیں۔ جب کوئی شخص محبت جتاتا ہے تو ہم اُسے پاگل سمجھتی ہیں یا پھر یہ سمجھتی ہیں کہ اس کی گرہ میں مال نہیں رہا۔ ہمیں صرف ایک چیز سے محبت ہے اور وہ ہے روپیہ ــــ!" اُس نے چاندی کا روپیہ کھنکھناتے ہوئے کہا۔"اس روپیہ سے ؟"

"اور جو لوگ تمہارے مکانوں پر آتے ہیں"؟

"وہ بے وقوف ہوتے ہیں یا اوباش۔ بعض عجیب الخلقت بھی آتے ہیں کوئی کہتا ہے تم میری بن جاؤ، میں تمہارے لئے بیوی چھوڑ سکتا ہوں، کوئی ہمیں غار دینے کے لئے خواہ مخواہ بیوی کا ذکر لے آتا ہے۔ اصل میں اس قسم کے لوگ گاؤدی ہوتے ہیں۔ جس مرد نے سہروں سے بیاہی ہوئی بیوی کی عزت نہ کی وہ ایک طوائف کی عزت کیسے کر سکتا ہے"۔

"بہر حال یہ کام تو بُرا ہی ہے"۔

"کیوں نہیں لیکن اس کی ذمہ دار عورتیں نہیں مرد ہیں" ــــ"ظالم مرد خدا کے دشمن"۔

"اس کا کوئی حل ہے"؟

"ضرور ہے یہاں کوئی تین ساڑھے تین ہزار عورتیں ہوں گی۔ میرا بس ہو تو بڑے بڑے کنجنوں کی دولت ضبط کر لوں اور جتنی اس پیشہ کی عورتیں ہیں ان

میں برابر بانٹ دوں۔ دولت اتنی ہے کہ عمر بھر کے لئے سب کی کفالت کر سکتی ہے، ان میں سے اسی فیصد کا نکاح ہو سکتا ہے اور جو معذور ہیں، ان کے لئے کنجوں کی دولت ہی سے ریسکیو ہوم RESCUE HOME کھولے جا سکتے ہیں۔"

"کیا اس کے لئے سب تیار ہوں گی۔"

"کیوں نہیں! حرام کی چکنی روٹی سے آرام کی سوکھی روٹی کہیں بہتر ہے۔"

"کیا اس طرح فحاشی رک سکتی ہے؟"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ فحاشی رک سکتی ہے یا نہیں؟ البتہ چکلہ ضرور ختم ہو سکتا ہے۔"

وہ ہمیں بیٹھک سے اٹھا کر خلوت خانے میں لے گئی۔ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا لیکن قرینہ سے سجا ہوا ایک طرف صوفہ سیٹ ایک تپائی پر ریڈیو دوسری طرف نواری پلنگ اس کے اوپر کی دیوار پر دو بڑے چوکھٹے لٹک رہے تھے، جن میں بہت سی تصویریں ایک ساتھ مڑھی ہوئی تھیں۔ اس کے نیچے بوڑھے اخبار "زمیندار" کا ایک دلچسپ تصویری تراشہ تھا۔

"خان لیاقت علی خان پاک پارلیمنٹ میں قرارداد مقاصد پیش کر رہے ہیں۔"

اس نے کھڑکی کھول دی ہمیں صوفے پر بیٹھنے کے لئے کہا خود پلنگ پر دراز ہو گئی۔ سامنے ایک قطعہ لٹک رہا تھا ؎

عصیاں سے کبھی ہم نے کنارا نہ کیا پر تُو نے دِل آزردہ ہمارا نہ کیا
ہم نے تو جہنّم کی بہت کی تدبیر لیکن تیری رحمت نے گوارا نہ کیا

اُس نے زاویہ قائمہ کے انداز میں انگڑائی لیتے ہوئے کہا "مجھے شادی کرنے میں اب بھی کوئی عذر نہیں۔ لیکن مَیں شوہر چاہتی ہوں۔ اگر کوئی شخص مجھے اس امر کا یقین دلا دے کہ وہ عمر بھر مجھے یہ طعنہ نہ دے گا کہ اُس بازار سے آئی ہو تو مَیں موٹا جھوٹا پہن کر اور رُوکھی سُوکھی کھا کر بھی گزارا کر سکتی ہوں زندگی بھر مکان کی چار دیواری سے باہر میری آواز نہ سُنیں گے۔ لیکن مجھ میں ماضی کا طعنہ سُننے کی ہمّت نہیں۔ جو عورتیں یہاں سے اُٹھ کر مردوں کے ساتھ چلی جاتی ہیں وہ غلط اُمیدوں پر جاتی ہیں۔ انہیں گرہستن کہلانے کا واقعی شوق ہوتا ہے لیکن جب وہ محسوس کرتی ہیں کہ اب بھی اُن کے وجُود پر گالی چڑھی ہوئی ہے تو اُن کی عَورت پھر مَر جاتی اور طوائف جاگ اُٹھتی ہے، آخر کار وہ یہیں چلی آتی ہیں۔"

ایک اور سوال کے جواب میں اُس نے کہا: "اب یہاں خاندانی کنچنوں کے مکان نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہی کوئی دس بیس گھر ہوں گے، یہ جو آپ بھرا بازار دیکھ رہے ہیں۔ یہ سب نوساختہ کنچنیوں کا ہے جنہیں بعض دوسرے اسباب یہاں کھینچ لائے ہیں۔"

"وہ اسباب کیا ہیں؟"

"یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ کچھ دن اس بازار میں پھریئے۔ آپ سب کچھ معلوم کر لیں گے مجھ سے نہ پوچھئے تو بہتر ہے۔"

تاہم ہمارے اصرار پر اس نے بتایا۔

"اس بازار کی آمدنی کے بڑے بڑے اڈّے کوٹھی خانے ہیں۔ ان کوٹھی خانوں میں سب کچھ ہوتا ہے مثلاً جسم بکتے ہیں، شراب بکتی ہے، افیون بکتی ہے اور جوّا ہوتا ہے۔"

"تو کیا یہ قانوناً جرم نہیں؟"

"جرم ہے، لیکن قانون، عورت، اور روپیہ کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ ویسے تو کوٹھی خانے قائم کرنا ہی خلافِ قانون ہے، لیکن ان پر پردہ ڈالنے کے لیئے ساز رکھے ہوتے ہیں۔"

"کتنے کوٹھی خانے ہوں گے؟"

"چھوٹے چھوٹے کوٹھی خانے تو کئی ہیں، لیکن بڑے چار ہیں:۔

ا...... کا کوٹھی خانہ:۔ یہ سیالکوٹی چودھری سب سے بڑے کوٹھی خانے کا مالک ہے۔ اس کے پاس دنیوی وجاہت کی ہر شے موجود ہے۔ تقریباً ایک درجن لڑکیاں ہیں سب شکل وصورت میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اس نامراد کا کہنا ہے کہ جب تک دہ پانچ لاکھ روپیہ پیدا نہیں کر لے گا اس پیشہ کو چھوڑے گا نہیں۔ اس کا ذاتی خرچ روز کا سو، سوا سو روپیہ ہے۔ ہر وقت

شراب میں دُھت رہتا ہے۔ اُس کی نائکہ بیوی جس کی شکل ڈراؤنی ہوتی جارہی ہے اپنے فن میں بڑی ماہر ہے۔ اس کا کام صرف گاہکوں کو لُوٹنا ہے جو اجنبی ایک دفعہ پھنس جائے وہ دوبارہ نہیں آتا، آدمی آدمی کو پہچانتی ہے لیکن ایک نئے پنچھی کے پَر کترنے میں اسے کمال حاصل ہے۔"

"یہ لڑکیاں کہاں سے آتی ہیں؟"

"کچھ تو باہر سے خریدی گئی ہیں۔ بعض سے چودھری "صاحب" نے نکاح پڑھایا ہے۔ یہ شخص اپنے حواریوں کی ایک جمعیت لے کر کسی گاؤں میں چلا جاتا وہاں اپنی رئیسی کا رُعب جماتا پھر ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق کوئی نہ کوئی عورت بیاہ لاتا ہے، خود نامرد ہے۔ اُس کے پاس جتنی لڑکیاں ہیں سب اُس کے دھوکے کا شکار ہیں۔ وہ ان سے دولت پیدا کرتا، دوستوں کو نذر گزرانتا اور عیّاش افسروں کو چڑھاوا چڑھاتا ہے۔ بارہا رائفل کے بے جا استعمال میں پکڑا گیا لیکن ہمیشہ چھُوٹ گیا۔ اُس کی رائفل بھی ضبط نہیں ہوتی یہ ان لڑکیوں کو رات بھر کے لئے باہر نہیں بھیجتا صرف "بڑوں" کی کوٹھیوں میں بھیجتا ہے۔ اس کا نرخ بھی گراں ہے۔ ایک شب کی قیمت سو سے اسّی تک، ایک مرحلہ کے بیس روپے، دو روپے بستر کا کرایہ، دو روپے دلال کے اور خلوت خانے میں جو کچھ لڑکی چھین لے وہ اس پر مستزاد۔"

"کیا ان لڑکیوں کا جی نہیں اُکتاتا — ؟"

اس کے پاس جتنی بھی لڑکیاں ہیں اُن کی حالت بڑی قابل رحم ہے لیکن وہ ایک سنگدل قصائی کے قبضہ میں ہیں اور قرونِ وسطیٰ کے قید خانوں کی زندگیاں گزار رہی ہیں۔ جس طرح گرہستنوں کا کام محض بچے پیدا کرنا ہوتا ہے اسی طرح ان کا کام محض دولت پیدا کرنا ہے اور وہ بھی چودھری اور اس کی نائکہ کے لیئے ۔۔۔ ان کے لیئے اگر کچھ ہے تو روٹی یا کپڑا، باقی انہیں کھڑکی سے باہر جھانکنے کی بھی اجازت نہیں ۔۔۔ اُن کی زندگی ایک پھوڑا ہے ۔۔۔ لاہور سوڑ ووڑ" ایک دفعہ ایک لڑکی نے بھاگنا چاہا پکڑ لی گئی پھر جو سلوک اُس سے کیا گیا وہ اتنا ظالمانہ تھا کہ تصور ہی سے رُوح کانپ اُٹھتی ہے۔ اس بدنصیب کو کئی روز تک بلاناغہ گھنٹہ دو گھنٹہ لٹکایا گیا ۔۔۔ اور مرچوں کی دھُونی دی گئی ۔۔۔ آخر کئی مردوں کے حوالے کیا گیا خود حُقّہ کی نے منہ میں لیئے تماشا دیکھتا رہا۔"

"کیا اس کو خُدا کا خوف نہیں؟"

اس نے استہزاً ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ آپ بھی عجیب لوگ ہیں ۔۔۔ خدُا کے خوف کا اس بازار سے کیا تعلق؟ ہمیشہ قصرِ شہی اور قصرِ عیش خدُا کے خوف سے خالی رہے ہیں۔ خدُا ہوتا ۔۔۔" وہ جذباتی ہوگئی۔" تو اس سامنے کی بڑی مسجد کے مینار صدیوں سے ساکت رہتے؟ اور راوی کا پانی منٹو پارک تک آ کر لوٹ جاتا؟ انسانوں نے خدا کو لوٹ لیا ہے معاذ اللہ۔"

۲........ دوسرا بڑا کوٹھی خانہ ہے۔ اس کا مالک مغویہ عورتوں کی کمائی

کھاتا ہے خود دیواری ڈھنڈاری ہے جو لڑکیاں گھر سے بھاگ آتی اور ان کے آشنا دغا دے جاتے ہیں اس ظالم کے کارندے انہیں پھنسا لاتے اور آہستہ آہستہ پیشہ کمانے پر لگا دیتے ہیں۔ اس پر کئی مقدمے چل چکے ہیں لیکن ہمیشہ بری ہو جاتا ہے ابھی حال ہی میں حسن بانو نام کی ایک لڑکی نے اس کے خلاف عدالت میں ایک دردناک بیان دیا تھا۔ خود چونکہ قانون کی نوک پلک جانتا ہے، اس لئے ضابطہ کے اندر رہ کر کاروبار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ شہر کے خوفناک غنڈے ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک رات بھی حوالات میں نہیں رہ سکتا ہے"۔

۳ ......" کا کوٹھی خانہ ہے، خیر سے حافظ جی ہیں بظاہر محلہ شیخوپوریاں میں واشنگ فیکٹری کھول رکھی ہے ایک حرافہ جو دل سے ساتھ نہیں اس کے نرغہ میں ہے۔ یہ اس سے نصف کی پتی لیتا اور چوری چھپے الکحل بیچتا ہے۔ جب سے حکومت نے شراب بند کی ہے یہ اور ایسے کئی لوگ سپرٹ میں کیمیاوی اجزا ملا کر شراب کے نام پر فروخت کر رہے ہیں۔ جس سے اکثر موتیں واقع ہو چکی ہیں"۔

۴ ......" کا کوٹھی خانہ ہے۔ یہ واحد عورت ہے جس نے بہت بڑے پیمانہ پر اپنا کاروبار چلا رکھا ہے۔ اس کی آمدنی کئی قسم کے لوگ کھا جاتے ہیں، اس کے ہاں مستقل لڑکیوں کے علاوہ باہر سے بھی کچھ لڑکیاں آتی ہیں"۔

یہ واقعہ ہے کہ کئی لڑکیوں کے والدین انہیں رات بھر کے لئے چھوڑ جاتے ہیں اور وہ دن چڑھے کمائی لے کر واپس چلی جاتی ہیں۔ کچھ از خود چلی آتی ہیں

ایک لڑکی جو کچھ کماتی اس کا نصف، مالکن لیتی ہے۔ کچھ مکان کے کرایہ میں وضع ہو جاتا ہے کچھ دلال لے جاتے ہیں اور لڑکی کے حصّہ میں ایک تہائی رہ جاتا ہے۔"

"ان لڑکیوں میں سے کسی کا پتہ معلوم ہے؟"

کیوں نہیں ـــــ لیکن کسی کے ماں باپ کا پتہ دینا ہمارے ہاں کا رواج نہیں ہے"

ان کے علاوہ جو چھوٹے چھوٹے کوٹھی خانے ہیں وہ کمی بیشی سے انہی لائنوں پر چل رہے ہیں۔ ایک بڑی مصیبت یہ آپڑی ہے کہ اب پڑھی لکھی لڑکیاں بھی شامل ہوتی جا رہی ہیں۔ اِدھر ایک لڑکی صغریٰ رہتی ہے جو فر فر انگریزی بولتی ہے لیکن ماں باپ کی غلطی سے یہاں آ بیٹھی ہے۔ اس نے کالج میں کسی نوجوان سے دوستی پیدا کی اور اسی کے ساتھ نکل گئی۔ وہ ذلیل انسان ہفتہ عشرہ ہی میں غائب ہو گیا۔ صغریٰ نے ماں باپ کی طرف لوٹنا چاہا کہ خاندانی عزّت کا بُت مزاحم ہو گیا اب بقول خود والدین کے شہر ہی میں والدین کی غیرت سے انتقام لے رہی ہے وہ کہا کرتی ہے "میرا وجود ایک دعوت ہے اُن لوگوں کے لئے جو ہمیں کھلونا سمجھتے اور اپنی خواتین کو صدف کا موتی کہتے ہیں۔ میرا ماضی ایک احتجاج ہے اُس معاشرت کے خلاف جو محض رواج ہی رواج ہے میرا حال ایک طنز ہے اُن باپوں کے خلاف جن کی بیٹیاں چوری چھپے معاشقے کرتی ہیں، میرا مستقبل ایک قبر ہے اور اس پر ایک ہی کتبہ ٹھیک بیٹھ سکتا

ہے — عمر

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

مَیں نے سوال کیا۔ "اگر تمہیں اس ملک کا وزیر اعظم بنا دیا جائے تو تم کیا کرو؟"

وہ مُسکرائی اور کہا۔ "مَیں سب سے پہلے تمام نشے بند کر ڈالوں — شراب چرس — بھنگ — افیون — چانڈو — !"

"کیوں ؟"

" اس لئے نہیں کہ شرعاً حرام ہیں، صرف اس لئے کہ ان کے استعمال سے جوان، جوان نہیں رہتا !"

ہم بے اختیار ہنسے، اُس نے کہا مُعاف کیجئے ہمارے مکان معمل ہیں ہر قوم کی عزّت اس کے جوان ہوتے ہیں مَیں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ ننوا ہیں سے سنز چہروں سے نوجوان ہیں لیکن ان کی ہمتیں بوڑھی ہو چکی ہیں۔"

ممتاز کی زبانی

کاش دُنیا میں کسی شے کا کوئی نام نہ ہوتا ——— شِلّر

شمشاد، امتیاز، ممتاز اور شہناز چار بہنیں ہیں۔ ان کا والد امرتسر میں برادری کا چودھری تھا، لاہور میں ان کی دو چچیری بہنیں ہیں زہرہ اور مشتری، آغا حشر والی مختار ان کی خلیری بہن ہے۔ ملک کی تقسیم سے پہلے چاروں امرتسر میں رہتی تھیں اور وہاں ان کا بڑا نام اور کام تھا۔ اب پانچ برس سے لاہور میں رہ رہی ہیں بڑی ملنسار ہیں، ان کا وجود ایک ڈیرہ دار طوائف کے خصائص کا صحیح مظہر ہے، ان سے ملنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ طوائف جس کی سرپرستی بادشاہتیں اور پھر ریاستیں کرتی رہی ہیں اس کی خصوصیتیں کیا ہوتی تھیں۔

شمشاد اپنے دن بتا چکی ہے اور اب اُس کی جوانی کا دمِ واپسیں ہے وہ ایک سرو قامت عورت ہے، رنگ سفید بدن اکہرا، کہا جاتا ہے جب اس کے عروج کا زمانہ تھا تو بڑے بڑے مہاراج ادھیراج اس کے مکان کا طواف کرتے وہ "اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ" کے محل میں گا چکی ہے شہزادہ

معظم جاہ اس کو مجرے کے لئے بلاتا رہا اس نے لاکھوں روپے کھرے کئے ہیں ان پڑھ ہے، لیکن بات چیت، لب و لہجہ، چال چلن اور نشست و برخاست اس قدر تستعلیق ہیں کہ یہاں بعض دوسرے گھروں میں یہ جامعیت بالکل نہیں ہے، اس کی شعلہ صفت آواز میں اب بھی ایک ٹھیراؤ ہے لیکن جوانی میں بڑے بڑے مغنّی لوہا مانتے تھے اُس نے زندگی بھر دیوانے پیدا کئے لیکن خود کبھی دیوانہ نہیں ہوئی، وہ عشق کو غالب کی ہمنوائی میں دماغ کا خلل سمجھتی ہے، اس کی مجلس میں آج بھی بڑے بڑے وارفتگانِ شوق چلے آتے ہیں۔ ادیب آتے ہیں وزیر آتے ہیں صحافی آتے ہیں خطیب آتے ہیں جج آتے ہیں لیڈر آتے ہیں چونکہ امرتسر کی اکثر سیاسی تحریکوں کا بڑا حصّہ اس کی نظروں کے سامنے گذرا ہے اس لئے وہ بعض اہم سیاسی معرکوں پر بھی گفتگو کر لیتی ہے۔

امتیاز اور ممتاز جڑواں بہنیں ہیں۔ امتیاز ان سب میں جسم کے اعتبار سے گاہکوں کا مرکز رہی ہے لیکن اب اس پیشے ہی سے متنفر ہے اس کا دل محبت کی ٹھوکر کھا چکا ہے کہا کرتی ہے جس شخص نے اس پیشہ کو ایجاد کیا تھا وہ آنکھوں سے اندھا، کانوں سے بہرا، زبان سے گونگا اور دماغ سے فاتر تھا، اس کی زبان میں مٹھاس ہے، وہ ایک ہوشیار سیاست دان کی طرح گمبھیر ہے، اپنے دل کا راز کسی سے نہیں کہتی، لیکن کسی کو دھوکا دینا بھی اس کی فطرت کے خلاف ہے، اب اس کا رنگ روپ ڈھل رہا ہے اور بدن بھی فربہ ہو چکا

ہے لیکن پھر بھی محبت کی چیز ہے اس کی سب بہنیں اس سے محبت کرتی ہیں اور وہ سب بہنوں کی منشا کے خلاف کسی اور سے محبت کرتی ہیں۔

ممتاز چھوٹی موٹی ہے اس کا رنگ کھلتا ہوا گندمی ہے، وہ طوائف ہونے کے باوجود مرد سے نفرت کرتی ہے۔ اس کا محبوب مشغلہ سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں میں لطائف گھڑنا ہے، وہ رات کا دیپک ہے لیکن دن میں اس کا چہرہ ایک سپنا سا محسوس ہوتا ہے اُس کی زبان کترنی کی طرح چلتی ہے۔ ہوا میں گرہ لگانا اور پانی پر لکیر کھینچنا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے اس نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی ہے، اپنے پیشے سے باہر کے واقعات کو بھی جانچ تول لیتی ہے بلا کی ذہین ہے، بذلہ سنج ہے، طناز ہے، موقع محل سے شعر پڑھ لیتی ہے، فقرہ باز ہے اس کو الفاظ مسخ کرنے اور ذو معنی جملے کہنے میں کمال حاصل ہے، گانی بھی خوب ہے، لیکن ناچنی نہیں، اس کا خیال ہے ناچنا ہر عورت کے بس کی چیز نہیں اور وہ بے بس ہے اُس کی رائے میں عورت محبت کرنے کی چیز ہے، سمجھنے کی نہیں اور مرد سمجھنے کی چیز ہے محبت کرنے کی نہیں، وہ کسی مرد کو بھی محبت کے قابل نہیں سمجھتی، اس کا لہجہ خواندہ ہونے کے باوجود کبھی کبھار کرخت ہو جاتا ہے لیکن جب وہ چٹکی لیتی ہے تو ایک دفعہ رونی سے رونی صورت بھی مسکرا اُٹھتی ہے۔

شہناز تینوں بہنوں سے چھوٹی ہے، اور اب خاندان کے لئے ایک

ہُنڈی سی ہے۔ اس کو دیکھتے ہی جو خیال معاً پیدا ہوتا ہے وہ آسکر وائلڈ کا قول ہے کہ "عورتوں کے سامنے کوئی فلسفۂ حیات نہیں، وہ جذبات پر جیتی اور جذبات کے لیئے جیتی ہیں وہ سوسن کا پھول ہے یا ایک مہک جو موتیا کی چٹخ سے پیدا ہوتی ہے، وہ عام انسانوں کے لیئے ایک لمحۂ فکریہ ہے ایک احتساب ہے، ایک سوچ ہے، ایک سوال ہے، ایک تختۂ چمن ہے، اس کے پیکرِ بدن میں قصائد کی تمکنت ہے، اس کی طبیعت میں غزل کا شگفتہ پن ہے، اس کا سراپا داغ کے بامحاورہ کلام کی طرح نستعلیق ہے اور اس کی آواز میں گونج اور گرج ہے، اس کے ناچ میں جوانی اور روانی ہے۔

شمشاد کو شکایت ہے کہ معیاری طوائف مٹتی جا رہی ہے اب لوگ فن کے قدر دان نہیں رہے صرف بازاریوں سے دلچسپی لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ "خاندانی" کنچن تو اُٹھتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ ویشیائیں آ گئی ہیں، ہر کوئی گویا ہے، ہر کوئی رقاصہ ہے، جس نے دو فلمی گیت یاد کر لیئے وہ مغنّیہ بن گئی جس نے بدن ہلانا سیکھ لیا وہ رقاصہ ہو گئی۔ اگر کسی چیز کو فروغ ہے تو وہ فحش کاری ہے، اس بازار میں پرانے گھر تو گنے چُنے ہی رہ گئے ہیں باقی تمام کوڑا کرکٹ ہے، کچھ بردہ فروشوں کا مال ہے کچھ بدانجام معاشقوں کی پیداوار ہیں، کچھ مفلوک الحال کُنبے ہیں، کچھ عادی پیشہ ور ہیں، کچھ کاروباری لوگ ہیں اور یہ جو ان کے ہاں ساز رکھے ہوتے ہیں محض دکھاوا ہے، اُستاد ہیں تو عطائی جو فن بڑی ریاضت

سے آتا تھا اب اس میں ہرا یرا غیرا اُستاد بنا پھرتا ہے، ناقدری کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ قدر دان اُٹھ گئے ہیں رہا سہا بھرم فلموں نے کھو دیا ہے اور جو گویا عورتیں تھیں وہ مرکھپ گئیں، کچھ وقت کے ساتھ بوڑھی ہوگئیں کچھ اچھے اچھوں کے گھر میں چلی گئیں بعضوں کو فلم ڈائرکٹروں نے بیویاں بنا لیا اور جو دو چار بازار میں نظر آتی ہیں اُن کی مٹی فلمی دُھنوں اور فلمی گیتوں نے خوار کر رکھی ہے، غزل سُننے والا تو کوئی رہا نہیں اور پہلے ہی کب تھے، چند گنی چُنی ہستیاں تھیں جن کی بدولت ہفتہ میں ایک آدھ محفل جمتی وہ شاد کام ہوتے کہ غزل سُن آتے ہیں؛ ہمیں اطمینان ہوتا کہ اچھی صورتیں ابھی مری نہیں —— اور اب یہ پُورا بازار پھر جاتیے شکل ہے تو عقل نہیں اور عقل ہے تو شکل نہیں بلکہ بڑی حد تک دونوں ناپید ہیں، سہ پہر کو فلم دیکھتی ہیں رات کو وہی گانے اور ناچ دہرا دیتی ہیں اور وہ اگلے سے لوگ بھی نہیں رہے، جیسا مُنہ ویسا تھپڑ کوئی خُدا کا بندہ گھنٹہ دو گھنٹہ گانا سُنے اور سو سوا سو روپیہ دے جائے تو غنیمت ہے ورنہ حالت یہ ہے کہ سات سات آٹھ آٹھ تو دولتوں کی ٹولیاں چندہ جمع کر کے آتی ہیں پچیس روپے رئیسی ٹھاٹھ سے نذر گزرانتی اور آوازہ قہقہوں یا دلچسپ آہوں کے ساتھ رخصت ہو جاتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں ہر گانے والی جنسی مشین ہے جس سے جو چاہے اور جب چاہے متمتع ہو سکتا ہے، ان میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں وقت وقت کی بات ہے انہیں کیا خبر کہ ان مکانوں میں رسم و راہ کے کچھ آداب ہوتے تھے

یا کبھی گویا عورتوں کے ہاں چاندی کے سکّے روئی کے گالوں کی طرح اُڑا کرتے تھے۔

ممتاز نے مداخلت کرتے ہوئے کہا آپا وہ دن لد گئے جب خلیل خاں فاختہ اُڑاتے تھے، لوگ سیانے ہو گئے ہیں تین سو روپے کے ریڈیو میں زمانے بھر کی رنڈیوں کے گانے سُن لیتے ہیں فلمیں ہیں کہ دس آنے سے لے کر تین روپے تک کے ٹکٹ میں ہر شخص فرق مراتب سے رقص و غنا کا لُطف اُٹھا سکتا ہے۔ ریاستیں ختم ہو گئیں رہ گئے نواب تو ان پر وہ کہاوت صادق آتی ہے "منہ چکنا پیٹ خالی"۔ اس کے علاوہ جو شوقین مزاج تھے اُنہوں نے ڈورے ڈال کر گانے والیوں کو گھر ہی میں ڈال لیا، ایک پنتھ دو کاج، گانے کا گانا کمائی کی کمائی جن رنڈیوں سے معیاری طوائف کا تصور قائم تھا وہ آہستہ آہستہ فلمی دُنیا میں چلی گئیں اب نہ پھیرے ہیں نہ آوازے، اگر کوئی اکّا دکّا کبھی کبھار فردوس گوش یا جنت نگاہ کا لُطف لینے آ جاتا تھا تو اب وہ بات بھی جاتی رہی ہے، اب تو فلم میں چاندی ہے شہرت ہے روپیہ ہے اشتہار ہے، غرضیکہ سبھی کچھ ہے بھلا کوئی ترغیب ثریّا، مدھوبالا، نرگس، منوّر سلطانہ، ممتاز شانتی، نمی، صبیحہ اور مہتاب کو اس بازار میں واپس لا سکتی ہے ـــــ ناممکن ـــــ اور جو خال خال رہ گئی ہیں وہ زندگی نہیں گذار رہیں بلکہ خود زندگی انہیں گذار رہی ہے۔

"لیکن موسیقی مر تو نہیں سکتی وہ تو فطرت کی طرح لازوال ہے"، مَیں نے ممتاز کی گفتگو کو قطع کرتے ہوئے شمشاد سے کہا اور شمشاد بولی :۔

جی نہیں، کبھی نہیں مر سکتی، وہ تو فطرت کے انعامات میں سے ایک انعام ہے، مَیں جو کہہ رہی ہوں، وہ نفسِ طوائف پر ہے میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ گویا طوائفیں ختم ہوتی جا رہی ہیں اور اگر کچھ رہ گیا ہے تو وہ ——؟

ممتاز نے آنکھ مارتے ہوئے کہا —— تو وہ ایڈیٹر ہیں یا لیڈر یا قاضی جی،

تو کیا تمہیں ان پر اعتراض ہے ؟

جی نہیں اور بالکل نہیں،

ممتاز کی عادت ہے کہ وہ بات کو بوٹی کی طرح توڑ لیتی اور شوربہ کی طرح بڑھا دیتی ہے،

ان مجلسوں میں ہمارے ایک دوست قاضی صاحب بھی ہمارے ہمراہ ہوتے، ممتاز ان سے ہمیشہ چٹکی لیتی موقع ملا نہیں اور اس نے وار کیا نہیں، پھبتیوں کا جھاڑ باندھنے میں بڑی ہی مشاق ہے،

تمام بازار میں اس پائے کی ایک بھی حاضر جواب نہیں، عاشورہ کے دنوں میں ان کے ہاں مجلس عزا منعقد ہوئی، ایک نوجوان ذاکر عزا خوانی

کے لئے بُلائے گئے ہمیں بھی یاد کیا گیا، ممتاز نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا قاضی نے دیکھا تو کہا، "ممتاز آج تو حسین باندی نظر آتی ہو۔"

ممتاز کو معلوم تھا کہ قاضی مجلس عزا کے خلاف ہے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ناک بھوں چڑھا رہا تھا —— چھٹتے ہی کہا،

"جی ہاں اور آپ بھی تو ابنِ زیاد نظر آ رہے ہیں۔"

قاضی صاحب ضرورت سے زیادہ نک چڑھے تھے دماغ تو خشک تھا طبیعت کو بھی سڑی رکھتے اوّل تو بولتے نہیں بولیں تو جلی کٹی باتوں پر اُتر آتے کچھ دوست بیٹھے تھے ایک اور جان پہچان کے دوست آ گئے ان کی بے ڈھب باتیں سُنیں تو پوچھا، آپ کی تعریف ؟

ممتاز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ ہیں قاضی عبوساً قمطریرا"

جن دنوں راوی کا پانی منٹو پارک تک آ پہنچا تھا ان کے ہاں باتوں ہی باتوں میں نصف رات گذر گئی، قاضی صاحب نے کہا چلو بھئی پانی مارکر رہا ہے کہیں یہاں تک نہ آ پہنچے اور ہم بے گناہ ہی ڈوب جائیں۔

ممتاز نے برجستہ جواب دیا، قاضی جی اُس کے لئے تو چُلّو بھر ہی کافی ہے۔

ممتاز گا رہی تھی تقریباً سبھی ایڈیٹر اکٹھے تھے —— ؏

زندگی چال چل گئی شاید

سازندے بے سُرے ہونے لگے، ممتاز نے لڑکا مجلس ختم ہوچکی تو قاضی نے کہا

آپ کے ہاں اناڑی سازندوں کا ہونا آپ کی شان کے شایاں نہیں۔

"جی ہاں! لیکن ان بے چاروں نے تو اب تقسیم کے بعد یہ کام سیکھا ہے"۔ شمشاد نے کہا،

"تو پہلے یہ کیا کام کرتے تھے"؟ قاضی جی نے پوچھا ممتاز کہاں رُکتی سگریٹ کا دھواں پھینکتے ہوئے کہا۔

"اجی یہ پہلے اخبار میں ایڈیٹر تھے"۔

ایک بڑے صحافی نے سوال کیا، آپ لوگ اپنے بیاہوں پر اتنا روپیہ صرف کرتے ہیں، آخر یہ کہاں سے آتا ہے؟

ممتاز مسکرائی "آپ جیسے شریفوں ہی کی رگیں نچوڑی جاتی ہیں"۔

کچھ بڑی بوڑھیاں جمع تھیں، ایک جھریائی ہوئی عورت نے کہا۔

"ممتاز! یہ میرے بازو پہ کیا لکھا ہے"۔

لکھا تھا بشن داس چاولہ،

ممتاز نے جلدی میں قمیص کا کف کھینچ کر ڈھک دیا اور کہا، خالہ! خدا کے لئے کسی اور کو نہ دکھانا، کہیں کوئی مُسلمان متروکہ جائیداد سمجھ کر الاٹ ہی نہ کرا لے۔

شہناز نے ایک دفعہ اپنا ڈرائنگ روم دکھایا اس میں صرف چہرے کی آرائش کا سامان ہی ہزار دو ہزار روپیہ کی مالیّت کا تھا، ممتاز بولی "یہ سب کنچن باوروں" کے پھندے ہیں"۔

جو عورتیں پیشہ کماتی ہیں اُن کے بچّے نک سک میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، اسی موضوع پر ایک دن باتیں ہو رہی تھیں۔

نوکر بازار سے چائے لایا پیالیاں ایک دوسرے سے مختلف تھیں شمشاد نے دوکاندار کو لتاڑا، ممتاز نے برجستہ فقرہ سے محفل کو زعفران زار بنا دیا۔

"آپ بلا وجہ بگڑتی ہیں، یہ بھی تو اپنے ہی بچّے بچیاں ہیں"۔

بعض دفعہ اس کے چھوٹے چھوٹے فقرے بڑے جاندار ہوتے ہیں اور وہ بے تکلّف کہہ جاتی ہے مثلاً وہ چکلہ کی ٹکیائی کو رات کا دیپک، طوائف کو رات کی رانی، میراثی کو شرافت کی ہچکی، نائکہ کو معذرت کا بول، عشق کو تندرستی کی اُبکائی، حُسن کو مرد کی میراث، مناکحت کو قید بامشقت، برات کو جنازے کی تمہید، اولاد کو گناہ کی دستاویز، مرد کو عیاشی کا مرقع اور عورت کو انفعالیت کی تصویر سمجھتی ہے۔

وہ مذاقاً کہا کرتی ہے اُس کا پیشہ ایک انقلابی مشن ہے اس کی ابتدا کیسے ہی ہوئی ہو لیکن طوائف نے ہر دَور کی رجعتی قوتوں کو ڈبویا ہے اُس نے ہر دولت مند سے مزدور کی محنت کا انتقام لیا ہے، جو کچھ جاگیردار مزارعوں

سے لوٹتے رہے ہیں طوائف اس معیشی استحصال کا جنسی بدلہ لیتی رہی ہے۔ اس نے جاگیرداری نظام کی موت کے قریب لانے میں برابر کا حصّہ لیا ہے، وہ ایک نسل کا انتقام دوسری نسل سے لیتی ہے وہ جانتی ہے کہ ایک محنت کش سرمایہ دار کے لئے زائد قدر پیدا کرتا ہے اور وہ اس زائد قدر کو جنسی شبخون مار کر ہتیا لیتی ہے اسی کی بدولت سرمایہ دار کی دولت گردش میں رہتی ہے۔

"معلوم ہوتا ہے تم نے اقتصادیات بھی پڑھی ہیں"—— میں نے ممتاز سے دریافت کیا۔

جی نہیں، مَیں نے کوئی کتاب نہیں پڑھی، مَیں نے صرف انسان پڑھے ہیں رنگارنگ کے انسان —— مثلاً ان گھروں میں کون نہیں آتا، سبھی آتے ہیں، رات کی تاریکی میں آتے اور پَو پھٹنے سے پہلے نکل جاتے ہیں وہ لوگ جو دن کو آنکھ ملاتے ہوئے ڈرتے ہیں، رات کو بیشا بنیاں گھستے ہیں، ہر شخص دن کے اُجالے میں طوائف کو گندی موری کہتا ہے لیکن جب رات اپنے بازو پھیلا دیتی ہے تو اس گندی موری ہی سے ان کے بھائی بند پیاس بُجھانے چلے آتے ہیں۔

ہر رات دس بجے بعد قلعہ کی سیڑھیوں، شاہی مسجد کی پیٹھ اور علامہ اقبالؒ کی قبر کے پاس جو پیکارڈ کاریں کھڑی ہوتی ہیں وہ ہمارے ہی شبینہ مہمانوں کی ہوتی ہیں یہ وہی ہیں جن کے قبضۂ قدرت میں بالواسطہ یا بلاواسطہ

عنانِ اقتدار ہے یہ جو ہمارے خلاف شور برپا ہے محض نمائشی ہے مذہب ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کے پاس دولت نہیں ہوتی اور گناہ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جن کا ہاتھ نہیں پہنچتا۔ گناہ نام ہے صرف ہمارے اپنے احساسات کے نشیب و فراز کا، کیا دُنیا میں سب سے بڑا گناہ صرف عورت کا عصمت بیچنا ہے یا اس کے علاوہ بھی۔ کوئی قول یا فعل گناہ کی زد میں آتا ہے؟ انسان انسان کا خُون چوسے تو وہ سیاست ہے، عوام خواص کو لوٹ لیں تو وہ دنگا ہے، خواص عوام کو بھڑا دیں تو وہ جنگ ہے، ملّا ضمیر بیچے تو وہ مصلحت ہے، صُوفی مداہنت کام لے تو وہ ریاضت ہے، لیڈر قومی سرمایہ ہڑپ کر لیں تو وہ خدمت ہے، لیکن عورت بالاخانے پر آ بیٹھے تو سوختنی اور کشتنی ہے، گنہگار ہے، فاحشہ ہے، چھنّال ہے، چھلاوا ہے، الغرض گناہ کا ایک ایسا پیکر ہے جس کی نسائیت مر چکی ہے ــ!

مَیں یہ نہیں کہتی کہ عصمت فروشی جائز ہے؟ عورت کی عصمت واقعی بڑی شئے ہے، اتنی بڑی شئے کہ دُنیا میں کوئی شئے بھی اس کی ہم مرتبہ نہیں لیکن مردوں نے ہمیشہ دھات اور کاغذ کی فوقیت کا اس کے مقابلہ میں چرچا کیا ہے ابھی تھوڑے دن ہوئے کوئی صاحب کہہ رہے تھے گنج قارون بھی ہو تو کنجروں کے ہاں کوڑی کوڑی لُٹ جاتی ہے۔ کمبخت دھن کے بغیر کسی کے نہیں، فلاں شخص کروڑ پتی یا لکھ پتی تھا، ان کے ہاں برباد ہو گیا، فلاں

دوست ان کے مکانوں میں ہزار ہا روپیہ خراب کر چکا ہے، کنگال ہو گیا ہے" طوائفیں نہیں جونکیں ہیں ـــ میں پوچھتی ہوں۔ ممتاز نے سگریٹ کا ایک لمبا کش کھینچتے ہوئے کہا۔ عورت کی عصمت زیادہ قیمتی ہے یا دھات کا سکہ اور اب تو وہ بھی نہیں رہا کاغذی نوٹ ہو گیا ہے۔

آپ ایک عورت سے اس کے حقوق تسلیم کئے بغیر کھیلتے ہیں، اس کی کوئی قانونی مسئولیت آپ پر عائد نہیں ہوتی۔ لیکن آپ کو شکایت ہے کہ وہ آپ کی جیب سے معاوضہ کیوں لیتی ہے؟ کبھی کسی مرد نے سوچا کہ وہ کیا دیتا اور کیا لیتا ہے؟ ہر طوائف کئی کئی خاندانوں کی "امانت دار" ہے۔ اس کی گود میں جو بچہ یا بچے ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی معزز باپ ہی کی اولاد ہوتے ہیں، ان کی مائیں ان کے باپوں کو خوب جانتی ہیں اور ان کے باپ بھی انہیں جانتے ہیں لیکن سرکار کے ہاں ولدیت کے خانہ میں ماں ہی کا نام لکھا جاتا ہے۔

یہاں کوئی شخص اپنی جائز کمائی نہیں لٹاتا، اور حلال کی کمائی کبھی سینکڑوں سے آگے بڑھ نہیں پاتی، جو لوگ یہاں آتے ہیں ان کے روپیہ پر ان کی مہر ملکیت ضرور ہوتی ہے، لیکن ان کا روپیہ، ان کا روپیہ نہیں ہوتا وہ یا لوٹ کا ہوتا ہے یا چور بازاری کا، یا غریب سے کمایا ہوا اور یا کسی نہ کسی واسطہ سے ہتھیایا ہوا ـــ لٹنا، لٹانا، ہارنا، گنوانا، اس قسم کے جتنے لفظی مغالطے ہیں وہ سب مردوں کی ذہنی فسطائیت کا نتیجہ ہیں۔ کوئی چیز حرام ہے تو وہ لوٹ کا روپیہ

ہے نہ کہ عورت کی عصمت! مرد کیا دیتا ہے سکّہ اور عورت کیا دیتی ہے عصمت؟ عجیب بات ہے کہ عصمت پر حرام کی مُہر لگ جاتی ہے اور سکّہ حلال کہلاتا ہے۔

ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا

مَیں نے کہا ممتاز! تم ایک پڑھی لکھی اور تجربہ کار لڑکی ہو، اسی لیئے تمہاری زبان فرفر چلتی ہے لیکن کیا تمہاری ہی منطق سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عصمت کا جوہر بیچنے کی چیز نہیں اور تمہارے ہاں لوگوں کی جیبیں کُتر لی جاتی ہیں۔

ممتاز بولی "بس مجھے اس آخری فقرے پر اعتراض ہے یہ کترنا ٹھیک نہیں، یوُں کہیئے خالی ہوجاتی ہیں اگر آپ اپنے نفس کو تسلّی دینا چاہتے ہیں تو یہ کہہ لیجئے،

مال حرام بود بجائے حرام رفت

اتنے میں اس کی بعض سہیلیاں آگئیں اور وہ اپنے مخصوص فقروں سے کھیلنے لگی۔ اِس پر چوٹ، اُس پر چوٹ، کسی پر پھبتی، کسی پر طعن، کسی کو گالی، کسی پر طنز اور کسی سے شوخی۔

جب یہ اکٹھی ہوتی ہیں تو اُن کا مذاق مردوں کی سطح پر آجاتا ہے صفیہ نے کہا۔ ممتاز، رات دیوالی ہے کہو کیا ارادہ ہے؟ تاشیں منگوالی ہیں، کوئی پنچھی نہ آیا، تو پھر روپیہ پوائنٹ۔

ممتاز نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ خال خال رنڈیاں ہی

پس انداز کرتی ہیں ورنہ اُن کی کمائی جس رستے سے آتی ہے اسی راستے میں نکل جاتی ہے، کچھ لگے بندھے لے جاتے ہیں کچھ نشوں کی نذر ہو جاتا ہے، کچھ اسراف کے چولھے میں پھک جاتا ہے، کچھ جوئے میں ہر جاتا ہے اور جو تھوڑا بہت جمع ہو جاتا ہے وہ رسموں کے پیٹ میں اُتر جاتا یا بیاہ شادیوں میں تباہی مچتی ہے، کنچنوں کے ہاں خوشی کی رسمیں بڑے ٹھاٹھ سے منائی جاتی ہیں۔

اس نے بتایا ابھی حال ہی میں الہٰی جان نے اپنے بیٹے کی مونڈن کرائی اور ہفتہ بھر مجرا ہوتا رہا، ایک خوشی میں ساری برادری کو شریک ہونا پڑتا ہے سب ناچتی اور گاتی ہیں، ان کے "ملاقاتی" انہیں "سلامیاں" دیتے ہیں اور اس طرح ہزار ہا روپیہ فراہم ہو جاتا ہے جس گھر میں خوشی ہو، وہاں کئی دن تک مختلف قسم کے کھانے پکتے اور ایک ایک وقت میں سینکڑوں آدمی شکم سیر ہوتے ہیں۔

ہجر والیوں کی شادی میں دس دن تک ناچ گانے کا بازار گرم رہا، ہر روز طرح طرح کے کھانے پکتے رہے، مختلف رسمیں منائی گئیں، دو رسمیں بڑی ہی عجیب ہوتی ہیں، ایک تو سندلیسہ کی رسم جب برادری کی عورتیں جلوس کی شکل میں مختلف گھروں کو بلاوا دینے جاتی ہیں اور ہر گھر فواکہات و مشروبات سے تواضع کرتا ہے دوسری گھڑا گھڑولی کی رسم جب برادری کی رنڈیاں ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے ہوئے قریبی کنوئیں تک جاتی اور وہاں پانی کے ڈول نکالتی ہیں، ہر شب مجرا ہوتا اور گئی رات تک رہتا ہے، ہر روز مختلف اللون کھانے تیار

ہوتے ہیں۔

پلاؤ اور پھر اُن کی قسمیں، موتی پلاؤ، کوکو پلاؤ، چنبیلی پلاؤ، نور پلاؤ، گلزار پلاؤ، انار دانہ پلاؤ، نورتن پلاؤ وغیرہ، اس کے علاوہ متنجن، سفیدہ، شیر برنج، شیرمال، قورمہ، شامی کباب، مرغ، مرغا، مرغابیاں، بٹیر، مربّے، اچار، چٹنیاں، گوشت اور ان کی مختلف قسمیں بالخصوص پالک گوشت۔

جب شادی ہو چکتی ہے تو دُلہا والے برادری کی عورتوں کو ارمغانی جوڑے دیتے ہیں، ہیجڑو والیوں نے نواب کے فی گھر ایک ریشمی جوڑا ایک ایک سونے کی انگوٹھی اور ایک ایک چاندی کی پلیٹ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

"یہ سب دولت کہاں سے آتی ہے"۔

"کہہ چکی ہوں کہ پنچھیوں کی جیب سے، جو لوگ نو گرفتار ہوتے ہیں ہم لوگ انہیں پنچھی کہتے ہیں جو رسم و راہ میں پختہ ہو جاتے ہیں انہیں طائرِ آہوتی"۔

"یہ آہوتی کیا ہے"؟

"لاہوتی کا معکوس اور میرے ذہن کی ایجاد ہے جو محض حاشیہ نشین ہوتے ہیں صرف نظر باز، ان کو کنجروں کی اصطلاح میں چالک کہتے ہیں"۔

"اور یہ شادیاں کہاں ہوتی ہیں"؟

"اکثر شادیاں باہر، غربا کے گھرانوں میں ہوتی ہیں کچھ آپس میں بھی کر لیتے ہیں"۔

"آپس میں؟"

"جی ہاں! ـــ خاندانی چوباروں میں دو طرح کی عورتیں بیٹھتی ہیں ایک وہ جو بہو کی بیٹیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً بھائی یا باپ کی بیٹیاں لیکن ان کی ماں جو بہو کہلاتی ہے سخت پردے میں رہتی ہے۔ اور ہمارے ہاں بہو کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ بہو بوڑھی ہو کر بھی پرائے مرد کے سامنے نہیں جاتی ـــ دوسری وہ لڑکیاں جو طوائف کے بطن سے ہوتی ہیں، اور ان میں شاذ و نادر ہی کوئی لڑکی بیاہی جاتی ہے۔"

"یہ بازاریاں، جو خدا جانے کہاں کہاں سے آمری ہیں، برادری کا ان سے کوئی تعلق نہیں، ہم انہیں اچھوت ہی سمجھتے ہیں انہوں نے ہمارے پیشہ کی لاج "گنوا دی ہے"۔

"تم نے کہا تھا کہ تمہاری دولت مسرفانہ طور پر ضائع ہو جاتی ہے، یہ اسراف کون کرتا ہے؟"

"کچھ تو رنڈیاں ہی عیبی ہو جاتی ہیں، مثلاً نصف فی صد کے تو شراب منہ لگی ہوتی ہے۔ تقریباً نوّے فی صد سگریٹ پھونکتی ہیں ان کی مائیں جو اب نائکہ ہو چکی ہیں انہیں جوئے کا لپکا ہے ایک ایک نشست میں سینکڑوں ہار دیتی ہیں پھر جب ہر جاتی ہیں تو شراب پینے لگتی ہیں، اور اس پر خاندان کے مرد ہیں جو پانچوں عیب شرعی ہوتے ہیں، اس سے قطع نظر یہ صاحبزادیاں خود بھی جوا اور ریس

کھیلتی ہیں، ان کے نزدیک پلیسہ اور سگریٹ کا دھوآں یکساں قیمت رکھتے ہیں۔"

"یہ صاحبزادیاں؟" قاضی نے تعریضاً کہا۔

"جی ہاں صاحبزادیاں! ایک طوائف ہر دولت مند کے ہاتھ عصمت تو بیچ سکتی ہے لیکن گود نہیں، ان کی گود میں جو بچے ہوتے ہیں آپ ان کے ناک نقشہ پر غور کریں تو ان سے بڑے بڑوں کی غمازی ہوتی ہے۔"

"یہ تمام بازار شرفا ہی کی کیاریوں سے بھرا پڑا ہے ۔

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے"

ایک سوال کے جواب میں ممتاز نے کہا ۔

"پنجابی خانہ بدوش قسم کے عیاش ہیں، ان کا متوسط کاروباری طبقہ جسم و آواز کی عارضی عیاشی کرتا ہے۔ سندھ کے بڑے بڑے زمینداروں کی عیاشی سادہ بھادوں کی ہے لیکن سرحد کے بعض خوانین سدا بہار عشق کے قائل ہیں ان کے ہاں دولت پھٹی پڑتی ہے۔ یہ لوگ نہ صرف کئی کئی بیویاں کرتے ہیں بلکہ ایک آدھ رنڈی کو گھر میں ڈالنا بھی جزو زندگی سمجھتے ہیں، ان کا کاٹا ہوا پانی نہیں مانگتا پچھلے ایک برس میں کوئی بتیس رنڈیاں ان کے ہاں گئیں نکاح پڑھوا یا مگر ایک ہی برس کے اندر اندر لوٹ آئی ہیں۔ ان میں سے ایک تہائی کو دِق ہو گئی۔"

ممتاز نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا ۔

"پنجابی کا عشق بھنورے کا عشق ہے، سندھی کا عشق مکھی کا عشق ہے اور پٹھان کا عشق چمگادڑ کا عشق ہے۔"

موسیقی

موسیقی تمام بنی نوع انسان کی مشترکہ زبان ہے ——— (لانگ فیلو)

شمشاد نے کہا، "موسیقی اور عورت میں چولی دامن کا ساتھ ہے جن منزلوں سے عورت گذری انہی منزلوں سے موسیقی، کبھی غنا عبادت کا جزو تھا بلکہ بعض روایتوں کے پیش نظر غنا تھا ہی عبادت کے لئے، لیکن آج اپنی فنّی عزّت کے باوجود ایک پیشہ ہوگیا ہے، آواز اور جسم دونوں بکاؤ چیزیں ہیں ہر کوئی گانے کی تاثیر کا قائل ہے" لیکن سوسائٹی میں جو عزّت ایک گوّیے یا گائن کی ہونی چاہیئے وہ نہیں ہے عوام غنا کو جنس اور مغنّی یا مغنّیہ کو دوکاندار سمجھتے ہیں ——— یہ معلوم کرنا تو بڑا مشکل ہے کہ پچھلے میں عورت پہلے آئی یا موسیقی یا دونوں ایک ساتھ، لیکن یہ صحیح ہے کہ دونوں میں قافیہ ور دلیف کا تعلق رہا۔ عبادت گاہوں میں بھی عورت رقص اور غنا اکٹھے رہے اور بالاخانوں میں بھی اکٹھے ہیں ——— جب تک موسیقی کا تعلق دھرم یا مذہب سے رہا دیوداسیاں باقاعدہ فنّی تعلیم حاصل کرتی رہیں اور وہ بہترین مغنّیہ ورقاصہ ہوتی تھیں،

طرح رقص و غنا کا حصول کنیزوں کے محاسن یا فرائض میں سے تھا۔ چنانچہ کنیزوں میں بڑی بڑی نامور مغنیّہ ہوئی ہیں، ایک خاص دور میں تو خود شاہی بیگمیں موسیقی میں استعداد بہم پہنچایا کرتی تھیں۔

جہانگیر کی بیوی اور شاہجہان کی ماں مان متی کو موسیقی میں جو استغراق رہا یہ اس کا اعتراف تھا کہ جہانگیر نے خواصوں کا ایک طائفہ تعلیم و تربیت کے لئے اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ مامون الرشید کی بہن علیہ کو موسیقی میں مجتہدانہ کمال حاصل تھا اس کے متعلق عربوں کا دعویٰ تھا کہ ساری دنیا میں اس پایہ کی مغنیّہ موجود نہیں ہے۔

اورنگ زیب کے جانشینوں میں — بہت سوں نے گویّا عورتیں اپنے حرم میں ڈال رکھی تھیں ان کی دیکھا دیکھی شہزادے بھی اسی ڈگر پر چل نکلے۔ آخری دور میں تو یہ حال یہ تھا کہ مغنیّہ اور مغنّی عام تھے صناع اور سپاہی ناپید!

یہ تو خیر محلوں کی دنیا کا حال ہے اور اس کے تذکرے تاریخ کے صفحوں کو کھنگالنے سے مل ہی جاتے ہیں لیکن اس بازار سے بڑے پائے کی گویّا اٹھی ہیں نورجہاں کی آواز میں جادو ہے۔ منوّر سلطانہ نے نورانی گلا پایا ہے۔ مختار بیگم اس عمر میں بھی بلا ہے فریدہ افسوں پھونکتی ہے۔ دہلی سے اختر جہاں اور اس کی دو بیٹیاں نایاب اختر اور آفتاب اختر آئی ہیں انہیں اچھی سوجھ بوجھ ہے۔ اختر جہاں خود تو بڑی سمجھدار ہے لیکن نایاب بھی آواز کے تیور جانتی ہے

ستار بھی خوب بجاتی ہے اور پکّے راگ سے آشنا ہے۔"

"پکّا راگ؟"

شمشاد نے بات اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"حقیقی راگ تو پکّا راگ ہی ہے باقی سب شاعری ہے جن لوگوں کو راگ یا راگنیوں سے آشنائی ہے وہ ان کے سحر کو جانتے ہیں ۔ یہ کمال صرف راگ ہی میں ہے کہ وہ ایک موسم میں دوسرے موسم کی یاد تازہ کرتا اور انسان کے ذہن کو ایک مجرد کیفیت میں منتقل کر دیتا ہے۔ اس وقت بڑے غلام علی خاں اپنے فن میں یگانہ ہیں۔ لیکن وہ نائک یا گندھرپ نہیں گُنی ہیں"۔

"یہ نائک، گندھرپ اور گُنی کیا ہیں؟"

"نائک موسیقی کے علاّمہ فہاّمہ کو کہتے ہیں۔ وہ شخص جو سنگیت کا علم جانتا ہو دوسروں کو پڑھا سکے خود تمام راگ گا سکتا ہو، دوسروں کو سکھا سکے، اور جو کچھ اسلاف نے موسیقی میں پیدا کیا ہے اس میں حک و اضافہ کر سکے اس کو نائک کہتے ہیں۔ آج تک صرف تیس نائک ہوتے ہیں جن میں خسرو، بیجو باورا اور واجد علی شاہ بھی شامل ہیں"۔

"گندھرپ، وہ ہے جو کل راگ جانتا ہو لیکن خود مجتہد نہ ہو۔ تان سین، بان خاں، چاند خاں وغیرہ گندھرپ تھے۔

"گُنی، جو صرف اپنے ہی ملک کے راگ گا سکتا ہو۔ لیکن اس کی نظر مارگ

راگوں پر نہیں ہوتی ہے"۔

"ان سے نیچے کلاونت کا درجہ ہے جو دُھر پد اور ترووٹ گاتا ہے۔ جو ٹپہ، ٹھمری، خیال اور غزل گائے وہ قوّال ہوتا ہے"

"اور یہ بائی کا مفہوم کیا ہے"؟

"ممتاز نے عادتاً چٹکی لیتے ہوئے کہا بائی کا مفہوم ہے BY THE WAY"

"لطیفہ اچھا ہے لیکن بائی ہے معزز لفظ"

"جی ہاں معزز تو ہے لیکن بعض لفظوں کی شہرت زمانہ کی ٹھوکروں سے داغدار ہو جاتی ہے، مثلاً خلیفہ کا لفظ ہے اب ہر اُس شخص کو خلیفہ کہتے ہیں جو پاؤں توڑ کے بیٹھا ہو، ایک بیکار وجُود!"

"بائی غالباً گجراتی کا لفظ ہے اور اس کا صحیح مادہ ایک گجراتی ہی بتا سکتا ہے لیکن جیسے ترکی میں ہر عورت کو خانم کہتے تھے یا ہمارے ہاں بیگم کا لفظ مروّج رہا اسی طرح بائی کا لفظ ہے۔ جو بھارت کے بعض علاقوں اور بعض گوتوں کی عورتوں کے نام کا جزو ہے۔ گاندھی جی کی اہلیہ محترمہ کا نام کستورا بائی تھا، راجہ مان سنگھ کی بیٹی جو اکبر کے حرم میں تھی اُس کا نام جودھا بائی تھا، ممکن ہے مسلمان اُمراء نے بیگم یا خانم کے الفاظ کی پاسداری میں بائی لفظ استعمال کیا ہو۔"؟

"آج کل عورتوں میں اچھی گائک کون ہے"؟

"وہ تو آپا بتا چکی ہیں" ممتاز نے سگریٹ کے دھوئیں کو حلق سے نیچے

اُتارتے ہوئے کہا ـــــ وہ خود بڑی گُنی رہ چکی ہیں۔"

شمشاد نے ایک سرد آہ کھینچی، جیسے کہہ رہی ہو ـــــ ع

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

ـــــ اور بات کو اُٹھاتے ہوئے کہا

"میں یہ تو نہیں کہتی کہ مجھ سا کوئی نہ تھا، لیکن زمانہ تھا کہ بڑے بڑے دہلیز سے آگے نہیں بڑھ پاتے تھے۔ ایک دفعہ آنجہانی مہاراجہ اندور ہمارے ہاں امرتسر چلے آتے تھے۔ کئی دفعہ شہزادہ معظم جاہ کے بلاوے پر حیدرآباد دکن کا سفر کیا ہفتوں قیام رہا۔ خود میر عثمان علی خاں کئی مجلسوں میں قدم رنجہ فرماتے معظم جاہ کا مزاج شاہانہ تھا، جب تک قیام ہوتا روزانہ ایک زرتار ساڑھی چند اشرفیاں اور کوئی نہ کوئی طلائی زیور انعام فرماتے۔ لیکن حضور بندگانِ عالی متعالی پرلے درجے کے کنجوس تھے کبھی کسی کو پھوٹی کوڑی تک نہ دی۔"

"ایک دفعہ میں گا رہی تھی، غزل کا کوئی شعر پسند آگیا، حضور نے جیب میں ہاتھ ڈالا حکم ہوا شمشاد آگے آجاؤ۔ میں نے فرشی سلام کیا۔ لوگ متحیر تھے کہ اعلیٰحضرت زندگی میں پہلی دفعہ کسی کو انعام بخش رہے ہیں لیکن نظام نے کیسہ میں سے قوام کی ڈبیا نکالی اور پوچھا پان کھاتی ہو؟"

"عرض کیا، جہاں پناہ! عادت تو ہے"

فرمایا، "جاؤ تمہیں پان کھانے کی اجازت ہے اور یہ لو قوام"۔

"دستور تھا کہ جب اعلیٰحضرت کسی مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو اُن کے سامنے کوئی شخص پان کھانے کی ہمت نہ کر پاتا تھا اور یہ میرے لئے ایک بڑا اعزاز تھا"۔

شمشاد نے سرد آہ بھری اور بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا ـــــ

"اب وہ دن خواب کی طرح بیت چکے ہیں۔ جوانی جا چکی ہے، بڑھاپا آ رہا ہے اور بڑھاپا ہی اصلاً ہوا نا مرگی ہے"۔

"آپ موسیقی کی تاریخ جانتی ہیں؟"

مختار نے یہ سمجھا کہ میں اس سے موسیقی کے اجزا پوچھ رہا ہوں، اس کا جواب نہایت مختصر تھا۔

"موسیقی کا مدار ارکانِ ثلاثہ پر ہے، لَے، تال اور سُر" لیکن جب میں نے اپنے سوال کی وضاحت کی تو اُس نے کہا ـــــ!

"آپ جانتے ہیں، میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ آغا حشر کاشمیری کی رفاقت میں بسر کیا ہے وہ میرے راہنما بھی تھے۔ شوہر بھی، اُستاد بھی اور محبوب بھی، وہ ایک فاضل اجل تھے۔ جب موڈ میں ہوتے تو باتوں کے دھنی تھے۔ کسی موضوع پہ طبیعت بند نہ تھی۔ ہر فن کی روح کو سمجھتے تھے، ایک دن بہت سے دوست جمع تھے۔ کسی نے سوال کیا۔

"آتماجی! غنا کا موجد کون ہے؟"

فرمایا ـــــ "فطرت!" پھر کیا تھا ایک دریا موج میں آگیا۔ کہنے لگے "انسان کو بولنا ہنسنا اور رونا تو پہلے دن ہی سے ودیعت ہو چکا تھا۔ ان کے امتزاج یا ترکیب سے گانا بھی مل گیا، فطرت کے مظاہر پر غور کریں ہوا کی سرسراہٹ، پرندوں کی چہچہاہٹ، بادلوں کی گھن گرج لے، تال اور سُر ہی تو ہیں"۔

"موسیقی یونانی لفظ ہے۔ اور موسیٰ سے مشتق۔ معنی ہیں ایجاد کرنا یا پیدا کرنا۔ جس طرح اُردو، فارسی عربی میں نسبت کے لئے یائے معروف لگا دیتے ہیں۔ اسی طرح لاطینی اور یونانی میں ق لگایا جاتا ہے۔ عربوں نے موسیقی کے حرفِ نسبت پر تو غور نہ کیا، لیکن ایک اور یائے نسبتی بڑھا دی جس سے موسیٰ موسیقی ہو گیا۔ بعض نکتہ طرازوں کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ نے پتھر پر جو عصا مارا تھا اور جس سے پانی کی بارہ نہریں یا سات چشمے پھوٹ نکلے تھے اُس سے زیر و بم کی جو مختلف صدائیں پیدا ہوئی تھیں۔ موسیٰ فی حقی۔ حضرت موسیٰ نے انہیں یاد کر لیا اور وہ آوازیں ہی موسیقی کے سات یا بارہ سُر ہیں"۔

" فخرالدین رازی نے لکھا ہے کہ اہل فارس کے نزدیک موسیقی کا موجد حکیم فیثاغورث ہے جو حضرت سلیمانؑ کا شاگرد تھا، لیکن اس سے بھی پہلے کی کتابوں میں موسیقی کا سراغ ملتا ہے ہندوؤں کے ہاں موسیقی کے لئے

سنگیت کا لفظ ہے، جس کے مفہوم میں گانے کے علاوہ ناچ اور بتانا بھی ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ موسیقی کے موجد دیوتا تھے اور سنگیت کے موجد شوجی مہاراج ——— بھرت رشی نے یہ علم اپسراؤں (جنتی رقاصاؤں) کو سکھایا، نارد رشی نے انسان کو سکھایا، چنانچہ اندر کے دربار میں جو لوگ رقص وغنا پر مامور تھے۔ ان میں سے رقاصہ کو اپسرا، گویّے کو گندھرا اور سازندے کو کنز کہتے تھے، اس کے برعکس ایک دوسرا خیال یہ ہے کہ اس کے موجد مہادیو ہیں، ان کی خدمت میں چھ دیو اور تین پریاں رہتی تھیں ان کا کام صرف گانا بجانا تھا۔ چھ دیو، چھ راگ ہیں۔ بھیروں۔ مالکونس، ہنڈول، دیپک، میگھ اور سری علیٰ ہذا القیاس۔ پریوں کے نام بھیرویں، ٹوڈی، اساوری اور راسکلی وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ جو کچھ ہے وہ نائکوں کی ایجادیں ہیں جنہیں پُتر (بیٹا) اور بھاریا (بہو) کہتے ہیں۔ ہندوستان میں موسیقی کا پہلا نقش سام وید کے منتر ہیں جن کو رِک کہتے ہیں۔ مصریوں کا دعویٰ ہے کہ موسیقی اور سازوں کے موجد ان کے دیوتا ہیں۔ اور ایک یونانی حکیم نے بھی اس کی تائید کی ہے لیکن یونانیوں کو اصرار ہے کہ ان کے دیوتا زیوس کی نو بیٹیاں "میوزس" اس کی بانی ہیں اور انہی کے نام پر میوزک یا موسیقی کا لفظ بنا ہے۔"

"توراۃ سے بنی اسرائیل کے اشتغال موسیقی کا پتہ چلتا ہے، حضرت آدم سے ساتویں پشت میں جوبل نام کا ایک شخص ہوا ہے اُس کے متعلق

کہا جاتا ہے کہ وہ چنگ وارغنون کا بانی تھا۔ حضرت داوٗد کے مزامیر مشہور ہیں انہوں نے مذہبی رسوم کی ادائی کے لئے موسیقی کی چوکیاں مقرر کی تھیں، چنانچہ اس زمانے میں چنگ، رباب، طنبورہ، جھانجھ، قرنا، ترُہیون وغیرہ کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے عہد میں بھی موسیقی کا زور بندھا رہا، پھر کچھ دیر کے لئے اس کی ہوا اکھڑ گئی، اور معابدِ یہود سے موسیقی کا فن قطعاً علیحدہ ہو گیا۔"

"یونان کے بعد روما میں، موسیقی کو عروج ہوا، اور وہ بہت کچھ آگے نکل گئے۔ رومیوں ہی سے ایرانی متاثر ہوئے، اور بڑا نام پایا، خود عربوں کا فنِ موسیقی کچھ نہ تھا، اُن کا تمام تر مواد ایران کی ساسانی موسیقی سے ماخوذ ہے۔"

"ابو مسجح پہلا عرب تھا جس نے فارس اور روم کے شہروں سے موسیقی کا سرمایہ جمع کیا۔ پھر حک و اضافہ سے عربی میں سہل و سادہ دھُنیں قائم کیں۔ اس کے بعد اسحاق موصلی جیسا نامور مغنی پیدا ہوا، جس کے کمال موسیقی کا شہرہ اُس عہد کے اطراف و اکناف میں تھا۔ ابو نصر فارابی نے قانون پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، ابنِ سینا اس فن میں بڑا ہی با کمال تھا، شہنائی اسی کی ایجاد ہے۔"

"چونکہ موسیقی الفاظ و معانی کی چیز نہیں بلکہ اس کا تعلق الحان و ایقاع سے

ہے، اس لئے حرف و لفظ اس پر قادر نہیں ہو سکتے، یہی وجہ ہے کہ فاتح قومیں کبھی مفتوح قوموں میں اپنا فنِ موسیقی منتقل نہیں کر سکی ہیں۔ بلکہ ان میں گھلنے ملنے کی وجہ سے انہی کے رنگ میں رنگی گئی ہیں۔ اس کی بڑی مثال ہندوستان کی مسلمان بادشاہتیں ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی سنگیت کا بڑا اثر قبول کیا۔ چند برائے نام تبدیلیاں کیں۔ لیکن وہ تبدیلیاں جڑ میں نہیں شاخوں میں تھیں چنانچہ مسلمان بادشاہتوں میں خلجی اور تغلق خاندانوں کی موسیقی سے دلچسپی کے واقعات عام ہیں۔ جس شاہی خاندان نے موسیقی سے بحیثیت فن اعتنا کیا وہ شرقی خاندان تھا۔ سلطان حسین شاہ شرقی نے موسیقی میں بعض نئی طرحیں لگائی ہیں ان کے علاوہ بہمنی اور نظام شاہی خاندانوں نے اپنے شوق و ذوق کو نمایاں کیا۔ چنانچہ ابراہیم عادل شاہ کو ظہوری نے جگت گورو کہا ہے"۔

"مغلوں میں اکبر کا عہد گویوں اور مغنیوں کی سرپرستی کے لئے مشہور ہے جہانگیر خود موسیقی کی نوک پلک سے واقف تھا۔ تمام ملک میں دہلی، آگرہ، لاہور، بیجاپور، احمد نگر اور احمد آباد کے گویے امراء کے ہاں ملازم تھے علاءالملک تونی اورنگ زیب کے وزراء میں سے تھا لیکن موسیقی کا ایسا ماہر سمجھا جاتا تھا کہ بڑے بڑے اساتذہ اس کی صحبت میں بیٹھتے تھے۔ ابوالفضل اور فیضی کے والد مُلّا مبارک موسیقی کے نکتہ شناسوں میں تھے۔ انہوں نے تان سین کا

گانا سُنا تو صرف یہ کہا تھا۔ "ہاں گا لیتا ہے"۔

؎ مُلّا عبد القادر بدایونی بین بجانے میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ مُلّا عبد السلام لاہوری، علامہ سعد اللہ شاہجہانی، شیخ علاؤ الدین موسیقی کے فاضلوں میں سے تھے۔ بیرم خاں کو موسیقی سے جو شغف رہا اس کی شہادت اس کے بیٹے عبد الرحیم خانخاناں کی فیاضیوں سے ملتی ہے۔ شیخ سلیم چشتی کا پوتا اسلام خاں جہانگیر کے عہد میں بنگال کا گورنر تھا۔ وہ اسّی ہزار روپیہ سالانہ صرف رقص و سرود کے طائفوں پر خرچ کرتا تھا۔ شہزادہ مراد بخش کو اورنگ زیب نے قید کیا تو اپنے ہمراہ سرس بائی کو لے گیا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس عہد کے خیال گانے والوں میں اُس کا ثانی نہ تھا۔ دورِ آخر میں مظہر جانجاناں اور میر درد بڑے مشاق تھے ان کے ہاں بڑے بڑے کلاونت اصلاحیں لیتے تھے"۔

؎ مختار آغا کی تقریر سنا رہی تھی۔ اور میں بڑے غور سے اس کے چہرے کو تک رہا تھا، جوانی مر چکی ہے لیکن آواز نہیں مری اس میں لدے پھندے دنوں کا کھرا اپن باقی ہے۔

اختر جہاں ایک رئیس کے نکاح میں ہے۔ آفتاب اختر بھی ایک رئیس ابن رئیس کی ملازم ہے۔ نایاب اختر کی کم سخنی ضرب المثل ہے۔ لیکن اختر کی ماں اور ان کی نانی ایک جہاندیدہ نائکہ ہے۔ ایک زمانہ بِتا چکی ہے اس

کے چہرے پر پھیلی ہوئی جھرّیاں اس کی مرحوم جوانی کے سنگھار کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ اس سن وسال میں بھی ایک شاہی کھنڈر معلوم ہوتی ہے جب کوئی فرد یا جمیعت گانا سننے آتی ہے تو پہلی نظر میں ان کا جائزہ لیتی ہے، ایک طرف اُستاد فن وکش ہوتے ہیں، دوسری طرف وہ بیٹھتی ہے۔ مرادآبادی پاندان سامنے رکھا ہوتا ہے، خود پان بناتی اور خود ہی پیش کرتی ہے۔ لیکن جب جانے پہچانے لوگ ہوں تو فوراً ہی نایاب کو بلا لیتی ہے، نایاب سمٹے ہوتے ریشم کی طرح آتی، ہاتھ کو قوس بناتے ہوئے سلام کرتی اور سنبل کے ڈھیر کی طرح بیٹھ جاتی ہے، اُس کی بڑی بڑی گول آنکھوں پہ اس کی دراز پلکیں جھکی رہتی ہیں۔ نایاب عادتاً غنچہ دہن ہے، ستار خوب بجاتی ہے۔ پکا راگ بھی گا لیتی ہے۔ لیکن یوپی کے دھان پان شاعروں کی ہلکی پھلکی غزلیں خوب گاتی ہے، اس کی صحبت میں اب بھی دہلی کے بعض کرخندار نواب، اور وضعدار اہل قلم بیٹھتے ہیں۔ اختر جہاں بڑی مجلس آرا ہے۔ تمام کُنبہ ٹھیٹھ اُردو بولتا ہے، اختر نے نایاب سے کہا، "چائے بنوا لو۔" کچھ وقت ہو گیا تو اختر نے نایاب سے پوچھا "چائے بن گئی ہے"؟ اُس نے کہا "اسٹو پر کیتلی رکھی ہے۔ حمزہ پتی لینے گیا ہے"۔ تھوڑی سی دیر ہوئی، اختر نے کہا "چائے تیار ہو گئی"؟ وہاں ابھی پانی گرم ہو رہا تھا۔ نایاب بولی۔

"ابھی تو پھول بھی نہیں پڑے ہیں"۔

غرضیکہ ان کے ہاں بات چیت نہایت شستہ ہوتی ہے۔ وہ گنوارپن جو اس بازار کی عام خصوصیت ہے، سارے گھر میں نہیں، دونوں بہنیں ایک ہفت روزہ جریدہ "رقص و سرود" نکالتی رہی ہیں، اب لاہور سے کراچی چلی گئی ہیں۔ سنا ہے کہ اچھے گھروں میں اُٹھ گئی ہیں۔

نایاب کا خیال ہے کہ حکماء نے موسیقی کا فن موسیقار سے ایجاد کیا ہے اس پرندے کی عمر ایک ہزار برس ہوتی ہے اور اس کی چونچ میں سات سوراخ ہیں، جب اپنی عمرِ طبعی کو پہنچتا ہے۔ تو گھاس پھونس اکٹھی کر کے اس کے ارد گرد ناچتا اور پھدکتا ہے۔ اس کی لے سے انبار میں آگ لگ جاتی ہے، پھر اس میں بھسم ہو جاتا اور اُس خاکستر ہی سے دوبارہ پیدا ہوتا ہے، اس پرندے کو ققنس، یونانی میں فینقس، پارسی میں آتش زن اور سنسکرت میں دیپک لاٹ کہتے ہیں۔

اختر جہاں کا کہنا ہے کہ ساتوں سُر سات جانوروں کی آواز سے نکلے ہیں کھرج مور کی آواز سے، رکھب پپیہے سے، گندھار بکری سے، مدہم کلنگ سے، پنچم کوئل سے، دھیوت گھوڑے سے اور نکھار ہاتھی سے۔

خواجہ نے کہا "جتنی معلومات بھی موسیقی کے متعلق اس بازار سے حاصل ہوئی ہیں۔ اُن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ موسیقی مردوں کی ایجاد ہے اور مردوں ہی نے اسے پروان چڑھایا ہے۔"

"جی ہاں"، اختر جہاں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "خود یہ بازار بھی مردوں ہی کی تصنیف ہے اور بالاخانوں کو بھی مردوں ہی نے پروان چڑھایا ہے۔"

خواجہ نے کہا، "غالباً آپ اس کو تعریض سمجھ رہی ہیں، میں تو واقعہ عرض کر رہا ہوں۔"

"تو میں نے بھی تعریضاً نہیں کہا۔ یہ بھی واقعہ ہے" اختر جہاں نے جواب دیا — !

قاضی بولا۔ "دیکھئے نا، رقص و غنا اس وقت سہ آتشہ ہو جاتے ہیں جب انہیں ایک حسین عورت اختیار کرتی ہے۔"

اختر جہاں بولی، "آپ درست فرماتے ہیں، اگر معلمی سے قطع نظر کر لی جائے تو سنگیت، عورتوں کی چیز ہے"۔

"یہ رقص کا موجد کون ہے؟"

"اس کا موجد بھی انسان ہے، بظاہر اس کی کوئی تاریخ نہیں لیکن رقص و غنا دونوں ہم عمر اور ہم رشتہ ہیں۔ کبھی رقص منجملہ عبادات تھا۔ اور توریت میں اس کا ذکر موجود ہے۔ لیکن اب اس کی حیثیت فنی ہو گئی ہے۔ قدیم الایام میں بیت المقدس کے ایک یہودی فرمانروا نے ہیرودیا نام کی رقاصہ کے نام سے متاثر ہو کر کہا، مانگ کیا مانگتی ہے"؟ اس نے کہا۔

"بپتسمہ دینے والے یوحنا کا سر" اور لے کے دم لیا۔ مصر کے ابتدائی طائفوں

میں جو رقاصائیں تھیں اُن کا دعویٰ تھا کہ وہ خاندانِ برامکہ میں سے ہیں۔ ہندوستان میں رقاصاؤں کو مُرلیاں کہتے تھے۔ جب پہلی دفعہ عرب تاجر ملتان میں وارد ہوئے تو ان کا ناچ دیکھ کر اسیر ہو گئے۔ القصّہ جیسے جیسے موسیقی میں دُھنیں بنتی گئیں ویسے ویسے رقص میں گتیں پیدا ہوتی گئیں۔ اب رقص حدِ کمال کو پہنچا ہوا ہے، جہاں موسیقی کو چُپ لگتی ہے وہاں رقص بولتا ہے۔ لیکن غنا کی طرح ایک قوم کا رقص بھی دوسری قوم سے مختلف ہوتا ہے۔"

"کیا اس بازار میں بھی کوئی رقاصہ ہے؟"

"آپ جانتے ہیں ہم لوگ دہلی سے آئے ہیں اور پناہ گزین ہیں، یہ ایک مکان (پکھراج منزل) دوسو روپیہ ماہوار پر مل گیا ہے۔ کچھ دنوں محکمہ آبادکاری کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن دفتروں میں تو شُرفا خوار پھرتے ہیں اور ہم ٹھہریں طوائفیں۔ چاروناچار اس مکان میں بیٹھ گئے۔ جو کچھ پس انداز کیا وہ کھا رہے ہیں۔ اب جو لوگ آتے ہیں انہیں آداب ہی کا علم نہیں، جو منہ میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہیں اور ہاں ...... آپ پوچھ رہے تھے کہ اس بازار میں بھی کوئی رقاصہ ہے۔ دوچار کے متعلق مشہور ہے کہ اچھا ناچ لیتی ہیں۔"

"شہناز، فریدہ، الماس، کاکو ــــ"

کاکو گاتی تو واجبی سا ہے، لیکن تھرکنا خوب جانتی ہے، یہ جو آپ لوگوں میں مشہور ہے کہ طوائف جونک ہوتی ہے تو یہ واقعی بعض خاندانوں پر صادق

آتا ہے وہ انسان کو انسان نہیں سمجھتے، ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ مرد کے پاس ہے، لوٹ لو پھر دھتکار کر رخصت کر دو، مثلاً..... سات بہنیں ہیں۔ اسی بازار میں ان کی حویلیاں کھڑی ہیں، ہر کہیں پہنچ سکتی ہیں۔ لیکن گفتگو ہے تو بلع، صورتیں ہیں تو سہانی، دل ہیں تو سنگی، جب کسی کی جیب پہ ہاتھ صاف کرتی ہیں تو خنجر بر آں ہو جاتی ہیں"۔

"لیکن یہ تو ہر طوائف کا شیوہ ہے، کوئی رنڈی بہ استثنا کسی مالدار سے محبت نہیں کرتی"۔

"آپ کا خیال درست ہے، لیکن فقدان محبت کے باوجود شرافت برتی جا سکتی ہے"۔

"اگر شرافت سے مراد زبان کی مٹھاس ہے تو وہ دو چار مکانوں سے قطع نظر ہر کہیں ہے۔ اور اگر شرافت میں دل کا اخلاص بھی شامل ہے تو مجھے اس کی صحت میں شبہ ہے۔ جب لوگ ان مکانوں میں آتے ہیں تو شہنشاہ ہوتے ہیں اور جب اُن کی کنی کٹ جاتی ہے تو ان کی زندگی صرف ایک داغ رہ جاتی ہے"۔

الماس کی آواز بڑی گوسنجدار ہے، چہرے پہ جوانی کی تمکنت ہے غالب خوب گاتی اور حفیظ عمزے سے پڑھتی ہے۔ ؎

ابھی تو میں جوان ہوں

موسیقی سے متعلق اس کی واقفیت کچھ زیادہ نہیں البتہ طبلے کی تھاپ طنبورے

کی آس، ہارمونیم کے نخرے اور سارنگی کے لہرے کو خوب جانتی ہے، الماس کے ہم نشینوں میں بڑے بڑے لوگ ہیں۔ اس کا وجود ایک ایسی تحریر ہے جس پر بہت سے لوگوں کے دستخط ثبت ہیں۔ اس کے سینہ میں کئی راز ہیں۔ بلکہ خود ایک راز ہے۔ اس کے نزدیک عورت مرد کی کمزوری سہی لیکن مرد بھی عورت کی کمزوری ہے۔ اس کی رائے میں جذبات کی شادی خودکشی پہ منتج ہوتی ہے عورت شادی سے پہلے روتی ہے اور مرد شادی کے بعد۔ وہ طوائف کے حرم میں بیٹھ جانے کی قائل نہیں۔ اس کا خیال ہے جس طوائف میں بیگم بننے کی ہمت نہیں وہ ہرگز بیوی نہ بنے۔ ایک طوائف کے لئے جو اس بازار میں ایک عمر بتا چکی ہو۔ گھر کا آنگن جیل خانہ ہے۔ جس طرح ایک گھریلو عورت طوائف کے ماحول کو سمجھنے سے معذور ہے، اسی طرح ایک طوائف گھر کی فضا سے نابلد ہوتی ہے۔"

اس کی باتیں بڑے ہی مزے کی ہیں۔ وہ کہا کرتی ہے، عورت مرد کو بزدل بناتی، شراب ذلیل کرتی اور موسیقی سلاتی ہے، اس کی نظر میں

"طوائفیں مد مکھیوں کا جھاڑ ہیں، ٹکیائیاں مویشیوں کا کھڑک ہیں اور میراثی سہ پہر کی دھوپ کا نڑتا" ——!

انٹرویو

"خدا ہمیں ان عورتوں سے بچائے، جو گلیوں میں فرشتہ، خانقاہوں میں بزرگ، بستر پہ بندر، میدان میں بے لگام خچر، باغ میں بکریاں اور گھروں میں شیطان بن جاتی ہیں"۔ (ایک مصنف)

بوڑھا کوچوان کوئی بیس برس سے تانگہ ہانکتا ہے وہ دن چڑھے نوگزے کی قبر کے اڈے پہ آجاتا اور رات گئے گھر کو لوٹتا ہے تمام دن وہ شاہی محلہ سے شہر اور شہر سے شاہی محلے کے پھیرے لگاتا ہے۔ چہرہ جھریا چکا ہے، آواز میں کرارا پن ہے، قامت منحنی جیسے امچور کی سفید پھانک، بڑی بڑی آنکھوں سے ابھی تک جوانی جھانکتی ہے داڑھی تیموری ہے۔ ناک چنگیزی، ہاڑ مغلئی فی الجملہ کسی گئے ہوئے وقت کی تصویر ہے۔

؟؟۔۔۔۔۔ "میاں! اب جوانوں کی رتی چڑھی ہوئی ہے۔ ہمارا چراغ بڈھا ہو گیا۔ آپ ہفتوں سے آجا رہے ہیں۔ یہ آپ کی شرافت ہے کہ فقیر کے دل میں بھی آپ کے لئے قدر پیدا ہو گئی ہے، ورنہ خوش پوش لوگ جن

پر دولت کا جھوٹا جھول چڑھا ہوتا ہے، ان مکانوں سے نکلتے ہیں، تو اُن کے لہجہ کی آب مرچکی ہوتی ہے، تانگہ میں بیٹھتے ہی ایسی جلی کٹی باتیں کرتے ہیں کہ ان کے حسب نسب کا اختر بنجر کھل جاتا ہے۔ بالخصوص نئی تانتی تو نٹ کھٹی کی وہ بات کرتی ہے کہ بسا اوقات طبیعت جھنجھلا جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے ان سے کہیں میاں آج کے چھپے آج ہی جلا نہیں کرتے لیکن ایک جیب میں بڑی خیر ہے۔"

"میری عمر اس وقت ساٹھ سے کچھ اُوپر ہے، زندگی جھنجھو جھونٹوں میں نہیں بتائی جو کچھ آج نظر آرہا ہے کبھی نہ تھا اور اب تو لقندروں کی بادشاہت ہے، ہر کوئی ہتھیلی پہ سرسوں جماتا ہے۔ پھر یہ اس بازار پہ ہی موقوف نہیں سارے شہر کی حیا مرچکی ہے جہاں تہاں جھوٹ کے وارے نیارے ہیں۔ آنکھ کا پانی بہہ گیا ہے۔ ہر کسی کا بہرہ کھلا ہوا ہے، جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتا ہے۔"

بڈھے کی عادت تھی کہ شاذ ہی بولتا تھا۔ ہر شب ہم اس کے تانگہ میں سوار ہوتے اور وہ ہمیں ڈیڑھ روپے میں میکلوڈ روڈ تک چھوڑ آتا، لیکن آج جو قاضی نے چھیڑا تو ایک دفتر کھل گیا۔ کسی نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ بڈھا جس کے تانگہ میں آپ جاتے ہیں، اس بازار کو پاتال تک جانتا ہے۔ اُس کی دولت یہیں لٹی ہے، کبھی وہ ایک متمول آدمی تھا، اس کی حویلیاں تھیں لیکن اب تانگہ ہانکتا اور گذارا کرتا ہے۔

"بابا! ہم تو اس بازار کے حالات پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں اور اسی لئے

کئی دنوں سے چکر لگاتے ہیں"۔

بڈھے نے پہلی دفعہ سر اٹھا کر دیکھا پھر مسکراتی ہوئی آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے"۔

معلوم ہوا، بڈھے کو مذاقِ سخن بھی ہے ــــــ اتفاق سے اس روز شہناز وغیرہ گھر میں نہیں تھیں اور ہم ان سے ملے بغیر واپس آرہے تھے، عجب بڈھے کی یہ باتیں سنیں، تو ہم نے علامہ اقبالؒ کے مزار پر تانگہ رکوا لیا اور چاہا اس سے کچھ پوچھ گچھ لیں۔

"سُنا ہے آپ نے بھی اس بازار میں بہت کچھ گنوایا ہے"۔

مَیں نے؟ ــــــ اس کا لہجہ قدرے توانا ہو گیا ــــــ جی نہیں! میں نے بہت کچھ کمایا ہے۔ یہ آپ سے کس نے کہا؟ وہ الفن کٹ چکی ہے جس سے ہم نے کبھی پیچ لڑایا تھا، اس گھر کی پرانی صورتیں گورکنارے ہیں البتہ ان کی اولاد میں سے دو بہنیں فلاں فلاں کے گھر میں ہیں"۔

خیر اس قصّے کو چھوڑیئے" حسرت مجھے دیکھئے، عبرت کا مُرقّع ہوں آپ کا خون تازہ ہے اسے ضائع نہ کیجئے۔ ان مکانوں سے کبھی کوئی سلامت نہیں گیا۔ ان بتکدوں میں ایمان کو دیمک چاٹ جاتی ہے۔ یہ عورتیں نہیں جونکیں ہیں، ان کے مرد بچھو ہیں ہر کوئی سنپولیا بلکہ گھیٹا ہے، ان کی

محبت روپیہ سے شروع ہوتی اور روپیہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے ہاں وفا، صبر، شرافت، خلوص وغیرہ نام کی کوئی سی شے نہیں صرف جسم ہیں یا بستر، آپ ان سے ایک ہزار برس رسم وراہ رکھیں اور گنج قاروں بھی لٹا دیں تو بھی آپ کے دوست نہیں ہوں گے، یہ انسانوں پر شیروں کی طرح دھاڑتے اور ہاتھی کی طرح چنگھاڑتے ہیں اور جب جیبیں کتر چکتے ہیں، تو ان کی عورتیں بلی کی طرح میاؤں کرتی اور مرد کتوں کی طرح بھونکتے ہیں۔"

"ہم یہاں یہی معلومات جمع کرنے آتے ہیں۔"

"میاں! ایک دفعہ کی چاٹ مدتوں پیچھا نہیں چھوڑتی ہے۔ یہ پہلا قدم ہی زنجیر ہو جاتا ہے۔ نظر کی گمراہیاں انسان کے دل و دماغ کو ہلا دیتی ہیں، اور نظر اس وقت تک نہیں تھکتی جب تک ہڈیاں نسچڑ نہیں جاتی ہیں۔"

"بابا! آپ بہت کچھ بتا سکتے ہیں۔ ان کی اصلیت آپ کے تجربہ میں ہے آپ کی کہانی کیا ہے؟"

"میری کہانی، عام انسانوں سے مختلف نہیں۔ یہاں ہر ایک سے یکساں بیتتی ہے۔ میرے باپ دادا متمول لوگ تھے، کئی مربعے زمین تھی، کئی حویلیاں تھیں۔ میں ان کا اکلوتا بچہ تھا۔ جب والد کا انتقال ہو گیا تو ایک لاکھ کے قریب نقد روپیہ تھا، اس وقت میں دسویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ آپ جانتے ہیں امیروں کے بچے عموماً غبی ہوتے ہیں۔ میں بھی پڑھائی میں

کچھ زیادہ ذہین نہ تھا۔ طبیعت کا رجحان کھیلوں کی طرف تھا۔ والد کی موت نے طبیعت کا ہر بند توڑ ڈالا، ایک دن کچھ دوست ہنسی ہنسی میں گانا سنانے لے گئے۔ رفتہ رفتہ عشق کا پیچ لڑ گیا۔ اس کا بھی سنِ آغاز تھا، میرا بھی، پہلی سہاگ رات کے پندرہ ہزار روپے ادا کئے۔"

"سہاگ رات؟"

"جی ہاں یہ ایک شریفانہ لفظ ہے، ورنہ ان کے ہاں کوئی سہاگ رات نہیں ہوتی، باجا نہ گاجا، مہندی نہ ڈھولک، براتی نہ دعوت کچھ نہیں صرف روپیہ، جسم اور بستر۔"

"جب نقد روپیہ ختم ہو گیا تو زمینیں گروی رکھی گئیں، وہ بھی بک گئیں پھر حویلیاں رہن رکھیں، آخر ان کا سودا بھی ہو گیا۔ اور جب سب کچھ دے چکا تو دیگ کی کھرچن کو بھی داؤں پر لگا دیا مگر پانچ برس میں ملا کیا؟ ایک جسم جو ہمیشہ پرایا تھا، ہڈیوں میں نقاہت آ گئی۔ عزت قہقہوں میں بٹ گئی کچھ دنوں تو ان کے ہاں پڑا رہا وہ بھی اوپرا سا التفات برتتے رہے لیکن وہ دن بھی آ گیا جب مجھے پان بنانے کے لئے کہا گیا اور گئے بندھے جو پہلے جھک کے سلام کہتے تھے اب مسکرا کے گذرنے لگے۔ میراثی خفگی کی نے تک نہ چھوڑتے۔ اب اس جسم کے کئی گاہک تھے۔ میں عشق کی بے بصری میں سب کچھ دیکھتا رہا اور آخر ایک دن ایسا آ گیا کہ میں ان کے ہاں اِکہ چلانے

لگا وہ لوگ جو میرے لئے چلمیں بھرنے تھے اب میں ان کے حقّے تازہ کرتا تھا یہ تانگہ چلانا میں نے انہی کے ہاں سیکھا ہے"۔

بڈھے کی آواز رُندھ گئی ـــــ قاضی نے سہارا دینے کے لئے کہا۔

"وہ اب کہاں ہے؟"

"وہ مر کھپ گئی ہے، اس کی ایک بہن نواب ..... کے ہاں ہے، دو بیٹیاں ..... کے گھروں میں ہیں، البتہ خلیری اور چچیری بہنوں کی اولاد اسی بازار میں بیٹھتی ہے"۔

"کیا وہ آپ کو پہچانتی ہیں؟"

"جی ہاں ان کے در و دیوار تک پہچانتے ہیں، آپ بازار میں چلے جائیے وہ تمام بلڈنگیں جو ان کے نام سے منسوب ہیں اس فقیر ہی کے کھنڈر پر تیار ہوئی ہیں۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ ان عمارتوں کی نیو محمد دین ..... کی دولت پر رکھی گئی ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ محمد دین اسی بازار میں تانگہ چلاتا ہے"۔

"لیکن آپ نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا؟"

"سوال پیشہ کا نہیں زندگی گذارنے کا ہے، میری کوئی اولاد نہیں، بیوی نہیں، رشتہ دار نہیں، اس نے مجھ پر ترس کھایا تانگہ دے دیا، میں چلاتا رہا، کماتا رہا، کھاتا رہا"۔

"یہ وہی تانگہ ہے"؟

"جی نہیں! یہ دوسرا تانگہ ہے لیکن ہے اُسی تانگہ کی کمائی کا۔"

"آپ کو چاہیئے تھا کہ آپ اس کی ناک کاٹ ڈالتے لیکن یہ ذلت گوارا نہ کرتے ــــــ"

بڈھے نے زور کا قہقہہ لگایا جیسے وہ یہ سننے کے لئے تیار نہ تھا۔

"میاں! یہ سب کہنے کی باتیں ہیں جو لوگ اس بازار میں آتے ہیں ان کی اپنی ناک آتے ہی کٹ جاتی اور غیرت غائب غلہ ہو جاتی ہے، البتہ جو چیز کچھ دنوں کے لئے طبیعت پر بوجھ بن کے رہتی ہے وہ ضمیر کا کانٹا ہے جس کو رفتہ رفتہ عیش کی آگ جھلسا دیتی ہے، اس وقت تو آپ یہاں بیٹھے ہیں، بازار میں ہوتے تو میں آپ کو دکھاتا، بیسیوں لوگ لٹ لٹا کر وہاں بیٹھے ہیں، کبھی نوگزے کی قبر پر ملئے میں آپ کو بتاؤں گا کہ کون کس عمارت کی اینٹ ہے"

"تو ابھی چلئے۔"

ہمارے اصرار پر بڈھا مان گیا، تانگہ کو اڈے میں کھڑا کیا، ایک نعل گیر نوجوان سے کہا، ذرا خیال رکھنا ابھی آتا ہوں۔

ہوٹل میں چائے کی میز پر ہم پانچوں بیٹھ گئے۔ دوسری میز پر "غالباً" اُستاد لوگ کھسر پھسر کر رہے تھے۔ بڈھے نے کہا "ان کی باتیں سنو، یہ اسی قماش کے لوگ ہیں"، ایک کہہ رہا تھا!

"یہ سب محمد دین کی ہڈیاں ہیں جو ان مکانوں کی بنیاد میں پڑی ہیں۔ خدا جانے وہ مر گیا ہے یا زندہ ہے۔ لیکن پچھلے دنوں کوئی کہہ رہا تھا کہ تانگہ چلاتا ہے اب جو یہ خانزادہ پھنسا ہے تو اس کے پاس لے دے کے بیس پچیس ہزار روپیہ ہوگا، اور وہ زیادہ سے زیادہ دس بارہ روز کی مار ہے"۔

"یہ روپیہ کیونکر ہتھیاتی ہیں؟"

"یہی تو ان کا فن ہے۔ سب سے پہلے تماش بین کی حیثیت کا جائزہ لیتی ہیں، پھر اسی کے مطابق اپنی طلب و خواہش کا نقشہ بناتی ہیں۔ ایک گراں قدر رقم ماہانہ مقرر ہو جاتی ہے، پھر مجرا ہے، اُستاد جی ہیں، لگے بندھے ہیں، جو اپنے آپ بیٹھے ہیں نوکر آتا ہے۔

"بی بی جی آج کیا پکے گا؟"

"مرغا، بٹیر، تنجن، بریانی وغیرہ اور آپ کی جیب خود بخود کھل جاتی ہے۔"

"آپ نے کہا چلئے سیر کو چلتے ہیں، اُس نے شاپنگ پر اصرار کیا، ہر پھیرے میں کئی کئی ہزار اُٹھ جاتا ہے، ان کے ہاں کپڑے کے کئی کئی سو جوڑے ہوتے ہیں، اور زیور کا تو کہنا ہی کیا ان کی طلب کبھی ختم نہیں ہوتی، ان کے ہاں رات کا عشق بڑا مہنگا ہوتا ہے، لیکن دن کا عشق کبھی گراں کبھی ارزاں"۔

"وہ دیکھئے چوبارے پہ ایک نائکہ بیٹھی ہے، بڑی مالدار اسامی ہے اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں۔ اِدھر اُدھر سے ایک لڑکی خرید کر جوان کی ہے

اور اب اسی کے سہارے جی رہی ہے، اس کی بوٹی بوٹی میں حرام رچا ہوا ہے۔ اُدھر پکھراج منزل کی سج دھج ملاحظہ کیجئے۔ اس کی مالکن خانہ نشین ہوگئی ہے، ہے پکّا پان، آج مری کل مری، وہ سامنے ہجرو کنجر کا مکان ہے، غور فرمائیے، بلڈنگ کا ناک نقشہ کیا ہے؟ وسط میں کتبہ لگا ہوا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکان حاجی چودھری ہجرو

اور اندر کیا ہوتا ہے ــــ؟ اس قطار کو دیکھ لیجئے، نیچے اُوپر بازاریوں کے مکان ہیں، کیا بن سنور کر بیٹھتی ہیں، اور وہ مسجد، ان مکانوں میں ایک مریل دوشیزہ کی طرح دبکی بیٹھی ہے۔ وڑیچ کا مکان ایک بڑا مذبح ہے، اور وہ سامنے کئی کوٹھی خانے ہیں ہر بڑی عمارت پر سنگ مرمر میں بحروف جلی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کھُدا ہوا ہے، یا تو ان کے مالکوں کا اسلام مر چکا ہے یا اللہ میاں ڈھیل دے رہے ہیں"۔

"یہ مُلّا لوگ جو ہر لحظہ اسلام اسلام کرتے ہیں وہ بھی تو آیاتِ الٰہی کی اس اہانت پر نہیں بولتے"۔

"اور ہاں یہ دیکھئے۔ وہ نوجوانوں کا غول سا ہے، سب ان کے بھائی بند ہیں، ہر کوئی دماغ چوٹا ہے۔ یہ تمام بچّے ایسے بُرے اُٹھے ہیں کہ ان میں کوئی بھی خود کماؤ نہیں، سب بہنوں یا ماؤں کے صدقے میں دندناتے

پھرتے ہیں، ان کی آنکھوں میں روشنی ہے، لیکن غیرت کی دنیا میں اندھیرا ہے۔"

"اُدھر موڑ کی کھٹیا پہ ایک کھوسٹ بیٹھا ہے وہ بازار کا چودھری ہے لیکن اس کا بانا غائب ہے اور اب تانا ہی تانا رہ گیا ہے۔"

"چیت رام روڈ کی بازاریاں اس ڈھائی ڈھوئی کے ملبہ کی پیداوار ہیں۔ کنچنوں کے ہاں خمیری روٹی پکتی ہے ان کے ہاں بے خمیر، ان کا کاروبار کچھ لو اور کچھ دو تک محدود ہے، یہ جو گہما گہمی نظر آتی ہے ان میں کچھ کن رسیے ہیں، زیادہ تر نظر باز جو اپنی جنسی تندرستی کے لئے آجاتے ہیں! یہاں بڑے بڑوں کی اینٹ سے اینٹ بجی ہے تب کہیں ان عمارتوں کی اینٹیں جڑی ہیں۔ ہر حویلی میں کئی خاندانوں کی اینٹیں ہیں خون ہے گارا ہے لیکن اب جو طوائفیں ہیں وہ غبارے ہیں، اور جو گویا ہیں وہ الشاذ کالمعدوم، میراثی ہیں تو وہ ہینچوں ہینچوں کرتے ہیں۔

"لیکن بابا! کچھ تو اچھی گویا ہیں۔"

"مثلاً"

"مثلاً مختار جنڈ والی۔"

"اس کا تلفظ غلط ہے۔"

"شمشاد۔"

"گا لیتی ہے، لیکن اب اس کا زمانہ بیت گیا ہے"۔

"فریدہ"۔

"وہ گاتی نہیں رانبھتی ہے"۔

"الماس"۔

"کبھی کوکتی اور کبھی ممیاتی ہے"۔

"اختری"۔

"وہ توغڑغوں کرتی ہے"۔

"انور بائی"۔

"لاحول ولا قوۃ، وہ ہنہناتی ہے، یا بھن بھناتی ہے"۔

"زرینہ"۔

"کڑکڑاتی ہے"۔

"الٰہی جان"۔

"چوں چوں کرتی ہے"۔

"زہرہ ومشتری"۔

"کائیں کائیں کرتی ہیں"۔

"عنایت بائی"۔

"بغبغاتی ہے"۔

"شمیم۔"

"جھنگارتی ہے۔"

"گلشن آرا۔"

"چنگھاڑتی ہے۔"

"اس کی بہن شمشاد۔"

"چوپٹ چٹاتی ہے۔"

"اور زاہدہ پروین ——؟"

"طوائف تو نہیں، پیرنی ہے، بس گا لیتی ہے۔"

"شہناز۔"

"بھرک لیتی ہے۔"

"توگویا آپ اس بازار کی جڑیں تک جانتے ہیں۔"

"جی نہیں! ان کی جڑ تو خاکم بدہن ان کا پروردگار بھی نہیں جانتا یہ آپ کو جتنی صورتیں بھی نظر آتی ہیں سب جھوٹے زیور ہیں۔"

اور یہ پہناوے اودے ہرے نیلے پیلے کالے سفید چمپئی جامنی دھانی شنگرفی فالسائی نارنجی لاجوردی زنگاری سردئی پیازی گلابی یا کاکریزی۔ جو آپ کو دریچوں میں اڑتے نظر آتے ہیں، یہ سب ہماری اور آپ کی جوانی کا کفن ہیں۔

"اور یہ بعض تانگے والے بھی تو صراف ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں صراف کیا؟ اس سے بھی کئی قدم آگے" "کچھ تو انہی میں سے ہیں، کچھ باقاعدہ دلالی کرتے ہیں، کچھ اس قماش کے ہیں کہ ان پر ایک پنتھ دو کاج کی ضرب المثل صادق آتی ہے، یعنی خود پیشہ ور ہیں کوٹھی خانہ کھول رکھا ہے۔ دو چار لڑکیاں ہیں خود گاہک لاتے اور دولت پیدا کرتے ہیں۔"

"ایسے کتنے ہوں گے؟"

"میرے پاس کوئی رجسٹر تو ہے نہیں اور نہ میں نے کبھی گنتی کی ہے لیکن دو اڑھائی سو سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں ان کی بڑے بڑوں تک رسائی ہے۔ یہ ایک کمپنی کی طرح کام کرتے ہیں، کچھ تو اس چوک میں رہتے ہیں کچھ میکلوڈ روڈ کے آزو بازو، کچھ قلعہ گوجر سنگھ کے اڑوس پڑوس، کچھ میٹرو ہوٹل کے باہر، کچھ الفنسٹن ہوٹل کے پہلو میں، اس کے علاوہ مزنگ، اچھرہ، مسلم ٹاؤن اور گاف روڈ پر بھی ان کی دوکانداریاں ہیں۔ انہیں ایک اشارہ کافی ہوتا ہے آپ جانتے ہیں گناہ چہرے سے بول اٹھتا ہے اور خواہش آنکھوں میں جھلک اٹھتی ہے۔"

"اور وہ لوگ جو یہاں آتے ہیں؟"

"ہر چور بازاری یہاں آتا ہے۔"

"اور یہ عورتیں؟"

"جو کچھ رات کو کماتی ہیں دن کو کھا پی جاتی ہیں، بعض کے نکھٹو شوہر ہوتے ہیں، وہ ان کے لئے سودا لاتے ہیں بعض محبت بھی کرتی ہیں۔ لیکن گاہکوں سے نہیں اوباشوں سے، جو کچھ رات کو ہتھیاتی ہیں دن کو انہیں کھلا پلا دیتی ہیں اکثر غنڈے انہی کی کمائی پر اینڈتے پھرتے ہیں۔ اگر وہ ان غنڈوں کو کھلائیں پلائیں نہیں یا انہیں ہاتھ میں نہ رکھیں تو یہ لوگ اکٹھے ہو کر ایسی دھما چوکڑی مچائیں کہ کوئی بتی بھی روشن نہ رہ سکے۔"

"تو گویا ان کی زندگی غنڈوں کے ہاتھ میں ہے۔"

"جی ہاں نوے فی صد کی زندگی غنڈوں کے ہاتھ میں ہے، زندگی ہی نہیں کمائی بھی، میرا اندازہ ہے ان بازاریوں کا نوے فی صد روپیہ ٹنگا ڑے کھا جاتے ہیں جو نشہ کہیں دستیاب نہیں ہوتا وہ یہاں ملتا ہے، شہر میں شراب بند ہے لیکن یہاں وافر ہے۔ کئی چوباروں میں افیون، چرس، بھانڈ، کوکین کی تجارت ہوتی ہے۔"

"بابا کبھی جوانی بھی یاد آتی ہے۔"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

"جی ہاں! جوانی مجھے ہی نہیں سب کو یاد آتی ہے لیکن انسان ماضی پر آنسو ضرور بہاتا ہے اس سے سیکھتا کچھ نہیں آدمی نے کبھی دوسروں کے تجربہ سے فائدہ نہیں اٹھایا وہ ہمیشہ خود تجربہ کرتا ہے، ہم کرتے ہیں غلطیاں اور نام رکھتے ہیں تجربہ۔ کس قدر افسوسناک بات ہے کہ زندگی کے سبق ہمیں اس

وقت ملتے ہیں جب وہ ہمارے لئے بیکار ہو جاتے ہیں ـــــ یاد رکھو دنیا کے بدترین کام ہمیشہ بہترین نیت کے ساتھ کئے جاتے ہیں"۔

محمد شریف (یہ لوگ ہمیشہ اپنا صحیح نام چھپاتے ہیں) ایک گٹھیلا نوجوان ہے وجیہہ ہے عمر بھی کچھ زیادہ نہیں، یہی کوئی بیس بائیس برس کے پیٹے میں ہوگا، ڈینٹل ہسپتال کے نکڑ پر سات آٹھ نوجوانوں کی ایک منڈلی کھڑی ہوتی ہے۔ سبھی دلال ہیں اور یہ اُن کا سرخیل ہے، بڑا خوش اخلاق ہے۔ شہری پنجابی اور گلابی اُردو خوب بولتا ہے، اس پیشہ پر ہم نے اُسے کئی دفعہ ٹوکا، پہلے تو عام عذر کرتا رہا کہ بیکاری ہے، پیٹ پالنا ہے، چھوٹے چھوٹے بہن بھائی ہیں، باپ مر چکا ہے ماں بوڑھی ہے۔ پھر ایک اور شخص سے پتہ چلا کہ اچھے گھرانے کا نوجوان ہے پہلے گھر کی پونجی پر ہاتھ صاف کیا اور عیاشی کرتا رہا، جب بڑے بھائی نے نکال دیا تو اپنی "محبوبہ" کے ہاں رہنے لگا کچھ دنوں اس کی دلالی کرتا رہا اب تقریباً سبھی کوٹھی خانوں کا گماشتہ ہے، اِس قلبِ ماہیت نے اس کے خیالات پلیٹ ڈالے ہیں، وہ گناہ کے تصور کو محض گفتگو کی چیز سمجھتا ہے، اُس کا خیال ہے جو چیز چوری چھپے کی جاتی ہے وہ گناہ ہے ورنہ اس کے علاوہ گناہ کا تصور محض اضافی ہے ـــــ شریف کا کہنا ہے جو لوگ یہاں آتے ہیں ان کی صورتیں زمانے کے لئے ضرور خوف یا تقدس پیدا کرتی ہیں لیکن ہمارے

لئے نہیں اس حمام میں بڑے بڑے لوگ ننگے ہیں۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ کون آتا اور کون جاتا ہے، جب رات کے گیارہ بجتے ہیں تو شاہی مسجد کی پلیٹھ کی سڑک پر رنگ برنگ کاریں آتی اور مال لے کر اُڑ جاتی ہیں"۔

"جو لوگ یہاں ٹھیرنا نہیں چاہتے وہ کوٹھیوں یا ہوٹلوں میں چلے جاتے ہیں، بعض سیر و تفریح ہی میں خوش ہو لیتے بعض دریا کا کنارہ ڈھونڈھتے اور بعض شہر کی طرف نکل جاتے ہیں وغیرہ"۔

یہ بستی گناہ و ثواب کے تصور ہی سے خالی ہے" اُس نے کہا "چوری کرنا جرم نہیں پکڑے جانا جرم ہے۔ سب لوگ گناہ کرتے ہیں۔ کوئی چھپ کے کرتا ہے کوئی کھلم کھلا کچھ اخلاقی یا قانونی دیواریں ہیں جو درمیان میں چن دی گئی ہیں، جو لوگ ان دیواروں کو پھاند جاتے ہیں ان کا گناہ گرفت سے باہر ہو جاتا ہے جو ان دیواروں پہ کھڑے رہتے ہیں وہ گناہ و ثواب کی گرفت میں رہتے ہیں اور جو ان دیواروں سے اس طرف ہوں وہ بے قید ہوتے ہیں"۔

"تمہیں کیا ملتا ہے؟"

"صرف گذر اوقات ہو جاتی ہے، ملے گا کیا؟ اس پیشہ میں کوئی عزت تو ہے نہیں"۔

"عجیب بات ہے تم لوگ ذلت کا اقرار بھی کرتے ہو اور پھر اسی کو اختیار کئے ہوئے ہو"۔

"جی ہاں! لیکن اس میں ہمارا قصور نہیں ایک تو سوسائٹی ایسی ہے دوسرے جب ہڈیوں میں حرام سرایت کر جاتا ہے تو غیرت یا احساسِ غیرت ختم ہو جاتے ہیں۔ کوئی جی دار ہو تو پانچ دس روپے دے جاتا ہے ورنہ ان عورتوں سے دس فی صد کمیشن مشکل سے ملتی ہے۔ اب لوگوں کے پاس پیسہ نہیں رہا۔ ورنہ مشتاقوں کی قطاریں بندھی رہتی ہیں۔ اب کوئی اکا دکا آنکلتا ہے یا ضرورت مند لوگ رشوت وسفارش کے لئے لے جاتے ہیں۔"

"کیا آپ لوگ خدا کے غضب کو قریب نہیں لا رہے"؟

"جی ہاں، خدا کا نام تو چاروں طرف بکھری ہوئی مسجدوں میں روز گونجتا ہے، لیکن خدا کا غضب کہیں نظر نہیں آتا، وہ دیکھئے عالمگیری مسجد کھڑی ہے، اُس کا گنبد بھی کھڑا ہے، اُس کے مینار بھی کھڑے ہیں، کبھی ان کی اینٹوں کو جنبش نہیں ہوئی، وہ سامنے قلعہ والیوں کی بلڈنگ ہے، لوح پر لکھا ہے:۔

"ھذا من فضل ربّی"

اڈہ شہباز خاں میں نوگزے کی قبر ہے، راویوں کا بیان ہے بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے وہ بھی چپ چاپ پڑے ہیں۔ وہ ٹکٹائیوں کی گلی میں حضرت قاسم شاہ کی خانقاہ ہے ان کی تربت بھی صبحِ قیامت کے انتظار میں چپ ہے

یہ ہفتہ دو ہفتہ میں محرم آرہا ہے، دسوں دن کاروبار بند رہتا ہے سب حسین کی نیاز دیتی، علم نکالتی اور مختلف ٹکڑیوں میں عزاداری کی مجلس رچاتی ہیں۔ ایک ایک کی زبان پر اہلِ بیت کے نام ہوتے ہیں۔ یہ چھاتی پیٹتی ہیں، ذاکروں کی ہچکی بندھتی ہے اور لوگ روتے ہیں، کوئی مسلمان شارعِ عام پر انہیں پاک بیبیوں کے نام لینے سے نہیں روکتا۔ لیکن کسی مسلمان کی بہو بیٹی کا نام بازار میں لو تو وہ مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا ہے، آپ کس کس زخم پر پھاہا رکھیں گے۔ تمام بدن میں ناسور ہیں۔"

"شریف خدا لگتی کہنا، اِن عورتوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔"

"یہ آج کل کے "شرفا" سے اچھی ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ جیسی بھی ہیں ظاہر ہیں لیکن "شرفا" کی آبرو تو کتابوں کی اوٹ میں جسمانی عیاشی ڈھونڈھتی پھرتی ہے، بابوجی" —— شریف کی آواز میں قدرے گونج پیدا ہوگئی —— "قدرت کبھی اپنا انتقام نہیں چھوڑتی، انہی لوگوں کی بیٹیاں کلنک کا ٹیکہ ثابت ہوتی ہیں جو دوسروں کی آبرو پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں، اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے لیکن ان بازاریوں کے متعلق تمہارا صحیح خیال کیا ہے۔"

"میرا خیال کیا ہوگا ظاہر ہے کہ انہیں عورتیں کہنا نسائیت کی توہین

ہے صحیح عورت تو ڈولی میں نکلتی اور کفن میں جاتی ہے وہ ماں کی کوکھ سے قبر کی گود تک ایک ستر ہوتی ہے۔

حمزی نے سعیدہ کے مکان پر ایک عمر گذار دی ہے۔ اس وقت اس کی عمر بچپن اور ساٹھ کے درمیان ہے، سعیدہ کی ماں کے عہد میں اُس نے اس گھر میں قدم رکھا تھا اور اب بیٹی کا زمانہ بھی گذار رہا ہے، قد لانبا ہے داڑھی صفاچٹ، مونچھیں خطِ استوا کو جاتی ہیں، رنگ کا کریزی ہے، دانتوں میں کھڑکیاں ہیں چہرہ سیاہی مائل ہے۔

اس بازار میں ایک بھی طبلچی اس کا ہم عمر نہیں جو کچھ کمایا اس سے ایک دو مکان خرید کئے ہیں، خود شرفا کے محلے میں رہتا ہے۔ غالباً دو بچے ہیں اور دونوں پڑھتے ہیں، ایک کالج میں ہے، ایک اسکول میں، اس کو طبلے کی جوڑی سے وہی عشق ہے جو ایک شہسوار کو گھوڑی سے ہوتا ہے یا ایک سپاہی کو تلوار سے یا کسی فن کار کو قلم سے، وہ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتا اس کا کہنا ہے۔ اب طبلچی تو اُٹھ گئے ہیں ان کی جگہ "مشلچی" آ گئے ہیں اور مشلچی اُس کی اصطلاح میں حرّاف کے لئے ہے۔ وہ ایک فنی طبلچی کو آرٹسٹ سمجھتا ہے، جہاں مغنی کی آواز لڑکھڑاتی ہے وہاں طبلچی سہارا دیتا ہے، اس کے نزدیک طبلے کی آواز نہ صرف گویوں کے عیب کی پردہ پوش ہے بلکہ ان کی لے کو

سے آتشنا کرتی ہے وہ طبلے کو موسیقی کے ایک اہم ساز سے تعبیر کرتا ہے،
اس کے نزدیک ہندوستانی یا پاکستانی سنگیت طبلہ کے بغیر ایک نظم معرٰی ہے۔
اس کو فخر ہے کہ طبلہ مسلمانوں کی ایجاد ہے، امیر خسرو ستار کے موجد تھے، ابن سینا
نے شہنائی ایجاد کی۔ ابو نصر فارابی "قانون" کے مخترع تھے، ان کے لئے سیف الدولہ
فرمانروائے شام نے اپنے دربار خاص میں ارباب نشاط کو بلوایا، ہر کسی نے
اپنے اپنے کمال کا اظہار کیا لیکن ابو نصر نے سب کو ان کی غلطیوں پر ٹوکا نتیجہ"
بڑے بڑے فن کار مہر بلب ہو گئے۔

سیف الدولہ نے ابو نصر سے پوچھا "آپ بھی اس فن کو جانتے ہیں؟"

"جی ہاں جانتا ہوں۔"

سیف الدولہ نے اصرار کیا کچھ سناؤ۔ ابو نصر نے ایک تھیلی سے لکڑی کے
چند ٹکڑے نکالے۔ انہیں ایک خاص ترتیب و ترکیب سے جوڑا اُن پر تار
کھینچے اور انہیں بجا بجا کے ایک ایسی دھن میں گانا شروع کیا کہ جو سنتا مارے
ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ ابو نصر نے اس ساز کو کھول کے نئی ترکیب سے جوڑا
اور سُر ملا کے گانا شروع کیا۔ اب لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔ پھر ساز کو کھول ڈالا
ایک نئے ڈھنگ سے جوڑا اور بجانا شروع کیا۔ اب سامعین پر غنودگی کا عالم تھا۔
سیف الدولہ سمیت سبھی سو گئے، ابو نصر نے ساز کھولا، تھیلی میں رکھا اور وہاں
سے چلا گیا ____!

"اب وہ کمال نہیں رہے، لیکن اُن کی کھرچن باقی ہے اور یار لوگ اُسے بھی چاٹ رہے ہیں"۔

"کچھ گِنے چُنے لوگ تو ہوں گے"۔

"جی ہاں اس بھرے سنسار میں کوئی سا فن مرتا تو نہیں مگر گھٹتا ضرور ہے کبھی تالی پیٹنا بھی ایک فن تھا۔ اب طبلہ بجانا بھی فن نہیں، ڈھونڈی نہ پیٹی طبلہ پیٹ لیا، وہ دیکھتے سامنے بیٹھک میں اکہرے بدن کا چھوکرا طبلہ پیٹ رہا ہے کہ نقارہ پر چوب دے رہا ہے، کبھی بائیاں ہمیں اُستاد سمجھتی تھیں اب ان چھوکروں کی وجہ سے مذاق اُڑاتی ہیں"۔

"القصہ جیسی روح، ویسے فرشتے۔ نہ انہیں بجانا آتا ہے نہ وہ گانا جانتی ہیں، فن کے چل چلاؤ کا زمانہ ہے اُدھر قدر دان اُٹھتے جا رہے ہیں اِدھر فن مٹتا جا رہا ہے۔ اب طبلہ نہیں بجتا، بندر گھگھیاتا ہے۔"

"آپ لوگ تنخواہ پاتے ہیں؟"

"جی نہیں جو کمائی گانے میں ہوتی ہے اس کا نصف بائی جی لیتی ہیں اور نصف سازندے ——— طبلچی سارنگیا اور ہارمونیم ماسٹر"۔

"روزانہ آمدنی کیا ہو گی؟"

"یہ تو گاہکوں پر منحصر ہے جیسا چہرہ ویسے گاہک، جیسی آواز ویسی آمدنی وہ پہلے سے حالات تو رہے نہیں زمانہ ہی تہی دست ہو رہا ہے، کبھی

سازندوں میں سے فی آدمی پانچ چھ سو روپیہ ماہوار کما لیتا تھا اور آج بھی دو اڑھائی سو مل ہی جاتا ہے لیکن اس کا انحصار مختلف گھروں کی ساکھ اور شہرت پر ہے۔ بعض اُلّو کی دم فاختہ ہیں، اُن کے سازندے بھی بچھیا کے باوا ہیں، اکثر فاقوں مرتی ہیں اُن کے کواڑ کئی کئی دن لگاتار کُھلے رہتے ہیں، بعض دُودھیل گائے ہیں اور ان کی لاتیں بھی سہہ لی جاتی ہیں۔ جہاں تک میراثیوں کا تعلق ہے، ان میں کانوں کا سچّا کوئی کوئی ہے، یا تو بھکڑ ہیں یا حاضر جواب، یا طنّاز، یا ضلع جگت میں مشّاق! ان میں چٹکی لینے کا ہنر نسلاً بعد نسل چلا آتا ہے، اور مُنہ آئی بات بے کھٹکے کہہ ڈالتے ہیں بعض گپ مارنے میں آندھی ہیں، رہا رنڈیوں کا سوال، تو یہ درزی کی سوئی ہیں کبھی گاڑھے کبھی کمخواب میں!"

"اور جو لوگ یہاں آتے ہیں؟"

"ظاہر ہے کہ ان ٹہنیوں پر بھانت بھانت کے پرند چہچہاتے اور اُڑ جاتے ہیں۔ ان آنکھوں نے ہزاروں قافلے لُٹتے دیکھے ہیں، سینکڑوں خیموں کی طنابیں کاٹ دی گئی ہیں۔ بیسیوں سنگھاسن ڈول گئے ہیں، لوگ بگولے کی طرح اُٹھتے، آندھی کی طرح چھا جاتے اور غبار کی طرح بیٹھ جاتے ہیں، ایک ولولہ لے کر آتے ہیں، ایک حسرت لے کر چلے جاتے ہیں۔ جن میں غیرت ہوتی ہے وہ دولت لُٹا کر عزّت بچاتے ہیں، جن کی غیرت مر جاتی وہ دولت کے بعد عزّت کی بازی لگا دیتے ہیں۔ بیسوا اور ہوا دونوں کا رُخ بدلتا رہتا ہے۔"

"لیکن جو لوگوں کے ساتھ چلی جاتی ہیں"؟

"کچھ تو واقعی گھروں میں بیٹھ جاتی ہیں اور ایسی کئی مثالیں ہیں۔ لیکن بیشتر لوٹ آتی ہیں۔ ان کے لئے گھر کی زندگی قید کی زندگی ہے۔ جن عورتوں نے فی الحقیقت گھر کی زندگی قبول کر لی ہے ان کا دامن اب سورج کی طرح اُجلا ہے، ان کی اولاد بھی نکونام ہے۔ البتہ اُن کا ماضی کہیں بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ جب بھی گھریلو عورتیں اکٹھی بیٹھتی ہیں ضرور کھسر پھسر کرتی ہیں اور مرد بھی جب کہیں اکٹھے ہوتے ہیں یہ ضرور کہتے ہیں کہ فلاں کے گھر میں طوائف ہے"۔

"یہ ایک عجیب بات ہے کہ طوائفوں کے بچے بالخصوص ان کے جو کسی کے حرم میں چلی جاتی ہیں بڑے ہی ہوشیار ہوتے ہیں۔ اس ہندوستان میں کئی نواب طوائفوں کے بطن سے تھے۔ خود پاکستان میں ایک آدھ ریاست کا فرمانروا اسی انگوٹھی کا نگینہ ہے۔ فلاں ادیب یا فلاں وزیر سے اس بازار کا کچھ نہ کچھ ناطہ ضرور ہے۔ آپ لوگ ان عورتوں پر ناک بھوں تو چڑھاتے ہیں مگر داد دیجئے کہ ان کے سینے بڑے بڑے رازوں کے مدفن ہیں۔ ان کا پیٹ سی آئی ڈی کی خفیہ دستاویزوں سے زیادہ خفیہ رہتا ہے۔ میں اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ طوائف جب تک نائکہ نہیں ہو جاتی وہ ضرور کوئی نہ کوئی حرم ڈھونڈھتی ہے۔ اس کے تحت الشعور میں یکسوئی کی خواہش چھپی رہتی ہے۔ اس کے دل میں دسترخوان بننے کے خلاف ضرور ایک احتجاج سا

ہوتا ہے لیکن جب دیکھتی ہے کہ اس بازار کی زندگی سے مفر نہیں اور لوگ اسے کھلونا سمجھ کے کھیلتے ہیں، تو وہ اپنی جوانی کا بدلہ دوسروں کی جوانی سے چکاتی ہے۔"

"نائکہ سراسر انتقام ہے اور طوائف سراسر کھلونا۔"

"اور آپ؟"

ہمیں اس بساط کے مہرے کہہ لیجئے۔" حمزی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"فرزین کہ پیادہ؟"

"کبھی فرزین کبھی پیادہ۔"

ہر نائکہ نسائیت کے ویرانہ آباد میں ایک کھنڈر ہے۔ نائکہ ایک بلاٹنگ پیپر ہے جو سیاہی چوستے چوستے سڑ جاتا ہے، اس برگد کی چھاؤں تلے سینکڑوں مسافر جوانی گذار چکے ہوتے ہیں۔ جب نشست پر بیٹھی ہو تو منہ میں حقہ کی نے لیئے یوں نظر آتی ہے، جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرا جگنوؤں کی روشنی کا سہارا لے رہا ہے، وہ پان بناتی ہے، وہ پان اکٹھے کرتی ہے، اس وقت اس کی زبان بڑی میٹھی ہوتی ہے اور جب معاملہ کرتی ہے تو اس میں قاتل سے زیادہ بیرحمی، چور سے زیادہ پھرتی، ڈاکو سے زیادہ سنگ دلی اور خائن سے زیادہ کجی آجاتی ہے۔ وہ اپنے ماضی کا قرض اپنی اولاد سے چکاتی ہے۔ کاکو کی ماں

اسی قماش کی نائکہ ہے لیکن وزیر کا سبھاؤ ذرا مختلف ہے۔ اُس کا خاندان پشتینی ہے لیکن اب پینیٹ اکھڑ چکا ہے۔ وزیر کوئی پینسٹھ برس کی عمر میں ہے۔ اُس نے راجوں کے رنواس اور نوابوں کے محل دیکھے ہیں۔ اس کے خاندان کی مورثِ اعلیٰ موراں بائی بڑی نامور رنڈی ہوئی ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ سے اس کا تعلق تھا۔ وزیر موراں کا نام نہایت ادب سے لیتی ہے، مہاراجہ رنجیت سنگھ موراں کو ملنے کے لئے اس کے مکان واقع چوک متی یا چوک چکلہ میں خود جایا کرتا تھا ہر جمعرات کو موراں ہاتھی پر سوار ہو کر حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر سلام کے لئے حاضر ہوتی۔ اُس نے چوک متی میں ایک مسجد بنوائی جو اب بھی موجود ہے اور مائی موراں کی مسجد کہلاتی ہے۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین بیچ اس مسئلہ کے....؟

ایک دن بعض سرداروں نے مہاراجہ کے کان میں یہ بات پھونکی کہ موراں آپ کی وفادار نہیں آپ کے دشمن کی دوست ہے، خواہ مخواہ آپ اس پر

لے "متو" نام کی ایک طوائف کی بنائی ہوئی مسجد کلکتہ میں بھی ہے۔ ایک شاعر نے اس کا مادۂ تاریخ نکالا ہے ؎

زکسبِ خاص متو ساخت مسجد بحرالبش و خولِ خاص و عام است
قلم بر داشتم چوں بہرِ تاریخ ندا آمد کہ ایں بیت الحرام است

خزانہ لٹا رہے ہیں۔ اور اگر واقعی وہ آپ کی وفادار ہے تو اس سے کہئے کہ آپ کے ساتھ جھٹکا کھائے، مہاراجہ نے موراں کو طلب کیا، پوچھا "تم جھٹکا کھاتی ہو؟" اس نے کہا "مہاراج بالکل نہیں"! حکم ہوا "آج کھانا پڑے گا۔" عرض کیا ——— "مہاراج! میں نے آپ کی ملازمت کی ہے، مذہب نہیں بیچا ہے۔"

رنجیت سنگھ کو تاؤ آگیا۔ تمام جائداد کی ضبطی کے احکام صادر کئے، بس پھر کیا تھا جو کچھ منقولہ وغیر منقولہ تھا، سورماؤں نے قبضہ میں لے لیا، موراں ہفتوں پریشان رہی، اسی دوران میں اس کی ایک درویش سے ملاقات ہوگئی، اُس نے دعا کی اور مہاراج دوبارہ مہربان ہوگئے۔ موراں حضرت گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار سے گھر واپس آئی تو نہ صرف گاڑیوں میں سامان لدا آرہا تھا بلکہ مہاراج بنفس نفیس تشریف فرما تھے۔ وزیر کا کہنا ہے کہ موراں سے دوسری پشت میں ہم لوگ امرتسر چلے گئے، اور تقسیم تک وہیں رہے۔ جو کمایا وہ الٹے تلوں کی نذر ہوگیا، امرتسر میں کئی سو ایکڑ زمین تھی۔ دو چار کوٹھیاں بھی تھیں وہ بھی بٹوارہ میں چھٹ گئیں۔

وزیر کی بیٹی ممتاز نے اپنے شباب میں مہاراجہ اندور کو مسحور کر رکھا تھا۔ مہاراج نے گانے کے لئے طلب کیا پھر وہیں روک لیا، ایک آدھ سال یورپ کے مختلف ملکوں میں ساتھ رکھا بکنگھم پیلس میں ملکہ کے ساتھ لنچ کھایا۔ یہ کسی

طرح افشا ہو گیا کہ ممتاز رانی نہیں داشتہ ہے تو اس پر سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے سخت سرزنش کی۔

اُدھر ممتاز کا دل ریاستی فضا سے اُکتا چکا تھا۔ ماں باپ امرتسر میں تھے مہاراجہ ملنے نہیں دیتا تھا۔ ایک روز مہاراجہ اور ممتاز مسوری جا رہے تھے۔ گاڑی دہلی پہنچی تو ممتاز نے شور مچا دیا یہ سب منصوبہ پہلے سے تیار تھا پولیس نے معاونت کی اور ممتاز والدین کے ہمراہ امرتسر آ گئی وہاں سے بمبئی کا رُخ کیا جہاں ممتاز نے ایک لکھ پتی تاجر بادلے سے عقد کا فیصلہ کر لیا مہاراجہ کے نوکر چاکر تعاقب میں تھے انہوں نے موقع پا کر سیٹھ کو قتل کر ڈالا اور ممتاز کو گرفت میں لے کر بھاگنا چاہا لیکن دو انگریز فوجی افسروں کی اچانک آمد سے ملزم موقع پر پکڑ لئے گئے۔ مقدمہ چلا۔ قائدِ اعظم بادلے کے پیروکار تھے۔ قاتلوں کو پھانسی ہو گئی اور مہاراجہ کو گدی چھوڑنی پڑی ملک بھر کے اخباروں میں مقدمے کا چرچا رہا اور آج وہی ممتاز جس نے بکنگھم پیلس میں بادشاہ اور ملکہ کے ساتھ شرفِ تناول حاصل کیا تھا، ٹکسالی کے اندر ایک خستہ حال چوبارے میں زندگی گذار رہی ہے۔ ایک بیٹی ٹکیائی ہے جس کی آمدنی سے کنبہ پلتا ہے۔

وزیر۔ رجواڑوں کی زندگی کا اور چھور جانتی ہے۔ اس نے نسلاً بعد نسلٍ نوابوں اور رجواڑوں کی چھاتی پر مونگ دلے ہیں، اس کا بیان ہے کہ ریاستی فرمانروا خلقتہً عیاش ہوتے ہیں ان کے ہاں صرف تین شخص رسا ہوتے ہیں۔

حکما۔ جو ان کے لئے کیمیائے عشرت تیار کرتے ہیں۔ حراف جو ان کے لئے لڑکیاں فراہم کرتے ہیں اور طوائفیں جو ان کے حواس پر قابو پاتی ہیں۔

ان فرمانرواؤں کی خوراک کا ذکر کرتے ہوئے ایک دفعہ اُس نے بتایا کہ ان کی غذائیں خاص قسم کے مرکبات سے تیار ہوتی ہیں ایک عام آدمی انہیں ہضم کرنے کا معدہ ہی نہیں رکھتا مہاراجہ اندور صبح کے وقت جو ناشتہ کرتے تھے اُس پر دو سو روپے خرچ ہوتے تھے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں جنہیں ان کے خوشہ چین ظل اللہ کہتے رہے اپنے حرم میں بہت سی بیویاں رکھتے تھے ان کے بے شمار بچے تھے جب کوئی مر جاتا تو اسے "اندرونِ خانہ" ہی شاہی قبرستان تک پہنچا دیا جاتا تھا ایک بڑی ریاست کے وزیر اعظم جن پر مہارانی لٹو تھیں اور بعض روایتوں کے مطابق ریاست کا ولی عہد ان وزیر اعظم کے صلب ہی سے تھا خود ایک مشہور طوائف پر جی جان سے فدا تھے، اس طوائف کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جب لڑکی جوان ہوگئی تو اس کی ماں کسی بات پر ناراض ہو کر لاہور آگئی اور لڑکی کو بازار میں بٹھانا چاہا وزیر اعظم نے سنا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی قانونی حق تھا نہیں صرف ایک نام تھا۔ کسی نہ کسی طرح طوائف کو دوبارہ راضی کر لیا اور وہ ریاست میں چلی گئی ایک رات جب ماں اور بیٹی دونوں سو رہی تھیں ایک خدمت گذار نے کئی ہزار روپے معاوضہ لے کر اس لڑکی پر پٹرول کا ڈبہ الٹ دیا اور آگ لگا دی اس طرح وہ لڑکی ایک مقفل کمرے ہی میں بھسم ہوگئی اور وزیر اعظم

کے دل کا کانٹا نکل گیا کہ اس کے صلب کی یادگار کو بھی طوائف بنایا جاسکتا ہے۔

ایک اور طوائف جو اب ایک بڑے متمول زمیندار کی منکوحہ ہے۔ مہاراجہ کے دربار کی خاص گویا تھی، اس کو پہاڑی گیت گانے میں خصوصی ملکہ تھا۔ ریذیڈنٹ نے اُس سے مہاراجہ کو زہر دلوانے کی سازش کی اس نے شراب میں زہر ملادیا مہاراجہ کو قبل از وقت معلوم ہوگیا۔ ریذیڈنٹ کے سامنے وہ بے بس تھا طوائف کو مروایا نہیں لیکن اُس کی تمام جائداد ضبط کر لی اور ریاست بدر کر دیا۔

وزیر کا کہنا ہے کہ تمام ریاستیں (بہ استثناء) بااختیار چکلے ہیں جو کچھ ان ریاستوں میں ہوتا ہے وہ چکلے میں نہیں ہوتا۔ آج بھی اس ملک میں بڑے بڑے نواب اور زمیندار اور اس ملک کے باہر خداداد سلطنتوں کے بادشاہ عورت کو شراب کے پیگ سے زیادہ وقعت نہیں دیتے ان کے حرم میں بے شمار بیویاں ہیں جن کی فطری خواہش مہینوں بلکہ برسوں تشنہ رہتی ہیں، چونکہ ایک دفعہ خداوندمجازنہ متمتع ہوچکے ہوتے ہیں لہٰذا ان کے جسم کو کوئی چھو نہیں سکتا۔ وہ قلعہ نما محلّوں میں قید رہتی ہیں اور جب انہیں کوئی راستہ ملتا ہے تو پرائے مردوں سے ملتفت ہوتی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ فحاشی کے بعض دوسرے اسباب بھی ہیں لیکن ایک بڑی وجہ ان متمول لوگوں کا نفسی ابتلا ہے۔ جب تک مرد اور عورت کے جنسی اختلاط

میں توازن پیدا نہیں ہوگا یہ فحاشی اور چکلے کبھی نہیں رُک سکتے؟

"لیکن اس کی بڑی وجہ اقتصادی بھی ہے"

"جی ہاں پیٹ تو سب کے ساتھ لگا ہوتا ہے لیکن اس میں جنسی خواہش کے فطری مطالبہ کو بھی بڑا دخل ہے"

"یہ صحیح ہے کہ آپ کے ہاں بڑے بڑے ادبی و سیاسی راہنما آیا کرتے تھے؟"

"جی ہاں! ہر بڑا آدمی اس کوچہ سے رسم و راہ رکھتا تھا۔ یہ دو نسلیں تو میری نظروں کے سامنے گذری ہیں، دراصل ربع صدی پہلے کے لوگ طوائف کو ایک ثقافتی ادارہ سمجھ کر اس کے ہاں آتے تھے ان کا معاملہ جسم کا نہ تھا ایک تہذیب کا تھا وہ بالاخانوں کو ایک کلب سمجھتے اور خوش وقت ہوتے تھے۔ سر سیّد شوق سے گانا سنتے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے چندہ فراہم کرتے وقت انہوں نے ایک طوائف سے بڑی رقم حاصل کی۔ مولانا شبلیؔ بھی آواز کا شوق فرماتے رہے ہیں شررؔ مرحوم بھی چوک میں ہو آیا کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد غبارِ خاطر میں اپنی آشفتہ سری کا اقرار کر چکے ہیں، مولانا محمد علی سیاسی سفر میں بھی فیض آباد کی آواز سن آیا کرتے تھے۔ علامہ اقبال کی امیرا بھی پچھلے دنوں مری ہے اور وہ خونکٹی کی دو بیٹیاں اڈہ شہباز خاں میں بیٹھتی ہیں ایک بڑے راہنما کے انقلابی مقاصد کا حصہ ہیں، رہا شاعروں یا ادیبوں کا قصہ تو ان کی کہانی ڈھکی چھپی نہیں، غالباً داغ کے ہاں بھی ایک طوائف تھی۔ "لیلیٰ کے خطوط" کی محرک کون

ہوا۔ منی جان جو قاضی عبد الغفار کے حرم میں تھیں اکبر الٰہ آبادی نے لوٹا بیگم سے نکاح پڑھوایا تھا، الغرض ؎

چرائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں اپنی

"آپ نے ان لوگوں کی قربت سے کیا محسوس کیا؟"

"ہم کیا محسوس کرتے یہ تو جو اُن کی صحبتوں میں رہ چکی ہیں وہی کہہ سکتی ہیں۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ حشر مختار کو جی جان سے چاہتے تھے، امیر سے کبھی اقبال کا ذکر آتا تو وہ مسکرا دیا کرتی۔ کچھ بھی ہو، یہ بہت بڑے آدمی تھے۔ ان میں کوئی بھی گنوار کا لٹھ نہ تھا۔"

"ابھی آپ نے نوابی غذاؤں کا ذکر کیا تھا، آپ بھی ان دسترخوانوں پر بیٹھی ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ کہیئے؟"

"اس میں علم یا خبر کی کوئی بات نہیں مشہور کہاوت ہے "گھی سنوارے سالنا بڑی بہو کا نام"۔ سب باورچیوں کے چوچلے یا چہلیں ہیں"۔

کہتے ہیں واجد علی شاہ صبح کے ناشتہ میں پانچ سیر غذا کا پاؤ بھر جوہر نوش فرماتے تھے۔ ان کے لئے ایک سیر پلاؤ ۲۴ سیر گوشت کی یخنی میں دم ہوتا تھا اور اسے ہضم کرنے کے لئے آبدار خانے میں طبی اصول سے پانی تیار کیا جاتا تھا۔ یہ محض من گھڑت افسانے ہیں کہ کنچنوں کے گھر میں مرغن کھانے پکتے ہیں،

جیسی روٹی آپ کھاتے ہیں ویسی یہاں پک جاتی ہے۔ کوئی مہمان ہو تو ہر کہیں تکلف برتا جاتا ہے۔

مائی وزیر نے سگریٹ سلگا لیا اور اس کے تہ بہ تہ دھوئیں پر نظریں گاڑ دیں پھر جب دھوآں ہوا میں تحلیل ہو چکا تو اس نے کہا ــــ "جوانی سلفے کا ایک کش ہے اور بڑھاپا دھوآں۔ جب یہ دھوآں اڑ جاتا ہے تو زندگی ختم ہو جاتا ہے ــــ"

عجیب وغریب

اُس کی سرو قامتی آہو چشمی سفید رنگت دوہرے دراز گیسو یا پھر سُرمئی دوپٹہ چوڑی دار پاجامہ اور پاؤں میں کمخواب کی لفٹی شریر نگاہوں کو ضرور اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ جب وہ ناز و لیے بناتا ہوا گذرتا ہے تو عموماً یہ دھوکا ہوتا ہے کہ کوئی بیاہتا عورت سُسرال سے میکے جا رہی ہے۔ لیکن وہ پیدائشی مخنّث ہے اُس کی گفتگو میں رنگینی نہ سہی، سنگینی ضرور ہے۔

——"مجھے چند گھنٹوں ہی کے لئے حکومت سونپ دی جائے تو تین کام کروں ——"

پہلا، شراب فروشوں کو قید میں ڈال دوں اور شرابیوں کو دُرّے لگاؤں۔

دوسرا، جواریوں کو اُلٹا لٹکا دوں اور نیچے سے آگ کی دھُونی دوں۔

تیسرا، وہ لوگ جو بہن اور بیٹی کی کمائی کھاتے ہیں انھیں توپ دم کر دوں۔

——یہ ہمارے آخری سوال کا جواب تھا جو خوبرو مخنّث شوکت نے دیا اور پھر زاویہ قائمہ بناتا ہوا یوُں نکل گیا جیسے ترکش سے تیر۔

شوکت کی عمر اس وقت ۲۵ اور ۳۰ کے درمیان ہے۔ ہم نے اُس سے پوچھا۔

"تم پیدائشی مخنّث ہو؟"

"جی ہاں! لیکن مخنّث تو پیدائشی ہی ہوتے ہیں۔"

"یہاں لاہور میں ایک لانبے قد کا مخنّث منیر جوگی گھوما کرتا تھا، جانے اب کہاں ہے؟ اُس نے مخنّثوں پر ایک کتابچہ لکھا یا لکھوایا تھا اس میں لکھا تھا کہ پیدائشی مخنّث اِکّادُکّا ہی ہوتے ہیں، سو میں سے پچانوے بنائے جاتے ہیں، بعض مرد ہی ہوتے ہیں اور بیشتر بچّے کمسنی میں خصّی کر لئے جاتے ہیں"۔

"ممکن ہے درست ہو اس قسم کی باتیں سُننے میں تو آتی ہیں مگر مخنّث بنانے کا معاملہ کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔ یہ ضرور ہے کہ بعض مرد شوقیہ مخنّث بن جاتے ہیں، مگر ہم نہ تو انہیں اپنے حلقہ میں بیٹھنے دیتے اور نہ اُن سے کوئی تعلق رکھتے ہیں"۔

"شوقیہ مخنّث کون ہوتے ہیں؟"

شوقیہ مخنّث وہ نوجوان ہیں جن کی طبیعتوں میں نسوانیت رچی ہوتی ہے۔ مثلاً ایسے نوجوان جن میں ماحول یا فضا کے باعث زنانہ پن آجاتا ہے، کچھ ایسے نوجوان بھی ہوتے ہیں جو محنت سے جی چُراتے ہیں، اُن کے رگ و پے میں حرام سما جاتا ہے، اور اپنی جنسی خواہشات کو صنفی جذبے یا نسوانی آرزو کے تحت از خود مفلوج کر دیتے ہیں جیسا کہ عرض کیا ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور نہ

ڈیرے دار انہیں اپنے ہاں ٹھہرنے دیتے ہیں۔

"ڈیرے دار سے کیا مراد ہے"؟

"جیسے خاندانی رنڈیاں "ڈیرہ دارنیاں" کہلاتی ہیں ایسے ہی ڈیرے دار مخنث ہوتے ہیں جو گدی در گدی چلے آتے ہیں"۔

"لیکن کنچنوں کے تو اولاد ہوتی ہے مخنثوں کے ہاں تو اولاد کا سوال ہی نہیں"

"ٹھیک ہے مگر ہمارے ڈیرے چیلوں اور بالکوں کی جانشینی سے چلتے ہیں ہم مخنث ایک دوسرے کو اپنا رشتہ دار سمجھتے ہیں، ہماری ایک خاص معاشرتی زندگی ہے۔ ہم کسی دُور دراز شہر میں چلے جائیں تو وہاں کے ڈیرے دار کا فرض ہو جاتا ہے کہ ہمارے قیام و طعام کا انتظام کرے، اُس کو مہمانداری سے ایک عزیزانہ خوشی ہوتی ہے۔ عورتوں کی طرح ہیجڑوں کی بھی قسمیں ہیں باکرہ، دوشیزہ، دُلہن، ادھیڑ، بوڑھی، ہمارا مقام کبھی محلوں میں تھا، اب جھونپڑوں میں بھی نہیں، کبھی حرم سراؤں کی محافظت پر مامور تھے، اب در در کی بھیک مانگنے پر مجبور ہیں، زمانہ زمانہ کی بات ہے ؏

کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

"لیکن یہ مخنث ایشیائی ملکوں ہی میں نظر آتے ہیں کسی یورپی ملک میں تو ان کا وجود ہی نہیں ہے"۔

"جب ایشیا میں مخنث ہیں تو یقیناً یورپ میں بھی ہوں گے، ہوسکتا

ہے کہ وہاں انہیں ہماری طرح ادارے کی حیثیت حاصل نہ ہو۔ کیونکہ یورپی ملکوں میں اس کا اظہار عیب سمجھا جاتا ہے ایشیائی ملکوں میں ہمیں ادارے کی حیثیت اس لئے حاصل ہوئی ہے کہ یہاں ہم لوگ شاہوں کے حرم میں خدمت گذار تھے۔ جب سلطنتیں اجڑ گئیں تو مخنثوں کا چراغ بھی مدھم ہوگیا، رفتہ رفتہ ہم گانے بجانے میں لگ گئے پھر یہی اوڑھنا بچھونا ہوگیا۔"

"مشرقی بادشاہوں کی تاریخ میں تمہارا ذکر بھی ہے۔"

کیوں نہ ہو؟ ہمیں لوگ ان کے محلوں میں اعتماد قائم رکھتے تھے، ورنہ انسانی نفس کی گمراہیاں تو جنگل کی آگ کو بھی پیچھے چھوڑ جاتی ہیں"۔

"جواز اچھا ہے لیکن تمہاری تاریخ تو محض بادشاہتوں کے زوال کی تاریخ ہے"

"یہ آپ کی فلسفیانہ باتیں ہیں اور مجھے ان کی کچھ خبر نہیں —— اب لوگ ہمیں ہنسی مذاق کا مضمون سمجھتے ہیں۔ یہ فطرت کا مذاق ہے کہ ہم مخنث پیدا ہو گئے اور یہ معاشرہ کی مہربانی ہے کہ ہم پھٹے حالوں جی رہے ہیں۔ ورنہ ہم کیا اور ہماری بساط کیا —— رُدئے زناں نہ رُدئے مرداں۔

ہماری بادشاہت لے دے کے ملک کافور سے شروع ہوئی اور ملک کافور پر ختم ہوگئی یا شجاع الدولہ فرمانروائے اودھ کی فوج میں ہمارے بھائی بند مختلف پلٹنوں کے سالار تھے، پھر تو شیرازہ ہی بکھر گیا اب وہ زمانے ہی خواب و خیال ہو چکے ہیں، کہاں بادشاہوں کی مصاحبت اور کہاں آبرو فروشوں کی معیت"۔

"مگر تم لوگ کاروبار کیوں نہیں کر لیتے"؟

کاروبار —— ؟ شوکت کے چہرے پر ایک قہقہہ سا پھیل گیا —— مردوں ہی کے لئے کونسا کاروبار ہے کہ مخنثوں کے لئے ہو۔ ہر گروہ کی ایک زندگی ہوتی ہے اور وہ اسی کے مطابق لشتم پشتم بسر کرتا ہے۔ قدرت نے ہمیں اس زندگی کے لئے پیدا کیا، سو جیسی بھی ہے گذر رہی ہے ٹھیک ہے جب معاشرہ کی حوصلہ افزائی اور ہماری تن آسانی نے ہمیں اس ڈگر پر لا ڈالا ہے تو یہی کاروبار ہو گیا ہے۔

"تو کیا تمہارا شغل محض گانا بجانا ہے"؟

"جی ہاں، بہ ظاہر یہی ہے، بازاروں میں ہم محض لوگوں کے اصرار پر ناچتے اور گاتے ہیں کچھ پیٹ کی مار بھی شامل ہوتی ہے لیکن ہمارا کام دو گھروں تک محدود ہوتا ہے، ایک جہاں بیٹا پیدا ہو، دوسرا جہاں لڑکے کا بیاہ ہو۔ لڑکی کی پیدائش اور شادی پر مانگنا ہمارے کوڈ میں جائز نہیں"۔

"لیکن سب مخنث تو خوش آواز نہیں ہوتے"؟

"جی ہاں! آپ کا ارشاد صحیح ہے لیکن مخنث نہ تو خوش چہرہ ہونے کی وجہ سے مانگتے جاتا ہے اور نہ خوش آواز ہونے کے باعث وہ تو محض مخنث کی حیثیت میں مانگتا ہے"۔

"اور یہ جسمی تعلقات"؟

اُس نے فوراً ہی میری بات اُٹھالی اور گونجدار لہجہ میں بولا۔

"معاف کیجئے سبھی لوگ ایسے نہیں ہوتے، کچھ "دانے" گندے بھی ہوتے ہیں، کیا مردوں میں بدکار نہیں؟ عورتوں میں بدقماش نہیں، جو حالت آج ہو رہی ہے اور جو کچھ مجھے معلوم ہے مشاہدے، مطالعے اور تجربے کی بنا پر ناگفتنی ہے ہمارا وجود تو آٹے میں نمک کے برابر ہے، بلکہ ماش کے دانے کی سفیدی سے بھی کم تر لیکن عورتوں اور مردوں کا تناسب تو چشم بد دُور روزافزوں ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم من حیث الجماعت بدنام ہیں"۔

"لیکن بازار شیخو پوریاں کی ایک تاریک سی گلی میں تو ——؟"

"جی ہاں مَیں سمجھ گیا"۔

"ایک دو مخنث دو کانوں کے چبوترے پر بیٹھے ہوتے ہیں"۔ اُس نے ایک سرد آہ کھینچی —— بس یہ سمجھ لیجئے کہ اُن کا بڑھاپا ویران ہو چکا ہے۔ وہ برگد کے ایک ایسے درخت کی اُداس چھاؤں ہیں جس کی دوپہر خانہ بدوشوں کو سہارا دیتی ہے"۔

"اچھا، تم کیا کما لیتے ہو؟"

"میں؟ —— ان دنوں تو مندا ہے، لیکن پھر بھی خدا کے فضل سے دو ارڑھائی سو ماہانہ مل جاتے ہیں اس میں ایک تہائی سازندے لے جاتے ہیں اور دو تہائی ہمارا ہوتا ہے —— حضور! ہماری قدر تو ہندو کیا

کرتے تھے، اُن کے ہاں بچّہ پیدا ہوتا تو کئی کئی مہینوں کے لئے بے نیاز کر دیتے، ہندو عورتیں ہمیں بابا لوگ کہتی تھیں، لیکن مسلمان تو الفاظ کے پتھر لُڑھکاتے ہیں، بُوڑھے ہیں تو وہ رمز کی بات کرتے ہیں، جوان ہیں تو وہ چٹکی لیتے ہیں، بچّے ہیں تو وہ تالیاں پیٹتے ہیں۔ العرض آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔"

"اتنا روپیہ کیا کرتے ہو؟"

"اپنی ذات کے لئے تو لوگوں کا دیا ہوا روٹی کپڑا ہی کافی ہے لیکن میرے کاندھوں پر قرض کا ایک بوجھ بھی ہے۔"

"کیا؟"

"والد لدھیانے میں ایک بڑے خیاط تھے، کاروبار اچھا تھا، اپنے چھ مکان تھے ہم چھ بہن بھائی ہیں —— چار بہنیں —— دو بھائی —— مَیں مخنّث نکلا۔ دوسرا بھائی ۱۹۴۷ء کی قیامت میں کام آگیا، والد ضعیف العمر ہیں، امّی بھی اسی سن کو پہنچ چکی ہیں جب تک لدھیانہ میں رہے میری کمائی کا ایک دھیلہ بھی حرام سمجھا، اب جو لُٹ پُٹ کے لاہور پہنچے تو کوئی سہارا نہ تھا، ان کی خواہش کے خلاف مَیں نے ہاتھ بٹایا ایک بہن بیاہی ہے، اور اُس کا شوہر سرکاری ملازم ہے، دوسری نے اس سال میٹرک کیا ہے، تیسری نے آٹھویں میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے، چوتھی تیسرے درجے میں ہے، پہلی دو بہنوں

کو مزید تعلیم سے روک دیا ہے۔"

"کیوں ؟"

" میاں! دریا میں جو کچھ جال دیکھتا ہے، وہ مچھیرا نہیں دیکھتا۔ میرا خیال ہے کہ ہماری تعلیم کا موجودہ نقشہ ہمیں اخلاقی انحطاط کی طرف لے جا رہا ہے ایک دن میری بہن نے مجھ سے کہا —— بھائی جان! ہم سب لڑکیاں ہماری مینڈھیوں کا مذاق اُڑاتی ہیں، کہتی ہیں ابھی تک پُرانی قطع کے بال بنا رہی ہو کئی دفعہ سفید برقعوں پر لٹو کا ہے، میں چُپ ہو رہا تیسرے روز دیکھا تو بہن بالوں کو سُلجھا رہی ہے، میں نے یہی مناسب سمجھا کہ انہیں اسکول سے اُٹھا لوں کیونکہ بالوں کا سُلجھاؤ ہی دلوں کا اُلجھاؤ بنتا ہے۔"

" شوکت تم بڑے باخبر ہو۔"

" صرف اس لئے کہ آنکھیں ہمیشہ کُھلی رکھتا ہوں آپ حیران ہوں گے کہ میں نے گھر میں ریڈیو نہیں رکھا۔"

" کیوں ؟"

" اس لئے کہ ریڈیو مشینی اُستاد جی ہے اور لڑکیاں اس سے تال سُر لگانا سیکھتی ہیں باور کیجئے ہماری معاشرتی زندگی میں جو نفسانی بے راہ روی اُبھر آئی ہے، اس کی ایک وجہ ریڈیو بھی ہے۔"

" کیا ہر مخنث کے لئے کوئی حلقہ مخصوص ہوتا ہے ؟

"جی ہاں! ہر مخنّث کے لیے ایک علاقہ مخصوص و مقرر ہے، وہ کمانے کے لیے اس سے باہر نہیں جا سکتا، اسی کا ہر علاقہ اس کی موروثی جائداد ہے، جب وہ مرتا ہے تو اپنے جانشین مخنّث کے نام منتقل کر جاتا ہے"۔

"قانوناً؟"

"جی نہیں، پنچایت کے روبرو "وصیت" ہو جاتی ہے۔ مثلاً قلعہ گوجر سنگھ کا علاقہ میرا ہے، یہ علاقہ میرے پاس ایک سکھ ہیجڑے نے تین ہزار روپے میں قبل از تقسیم گروی رکھا تھا، جب بٹوارہ ہو گیا تو وہ اپنے والدین کے ہمراہ مشرقی پنجاب چلا گیا، میں لدھیانے سے لاہور پہنچا اور اپنے تصرف میں لے آیا۔ لاہور کے مخنّثوں نے کوشش کی کہ تین ہزار روپے لے کر یہ علاقہ اُن کے نام منتقل کر دوں لیکن میں مہاجر تھا اور مجھے کوئی نہ کوئی حلقہ الاٹ ہونا ضروری تھا"۔

"تو کیا یہ حلقہ تمہیں محکمہ بحالیات نے الاٹ کیا ہے"؟

شوکت نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"جی نہیں، پنچایت نے! محکمہ بحالیات نے تو مجھے مخنّث سمجھا اور مکان بھی الاٹ نہ کیا حالانکہ میرے والد نو دولتوں سے کہیں زیادہ صاحب جائداد تھے"۔

"تمہارا کوئی پیر اُستاد ہے"؟

"جی ہاں! ہم اپنے پیر کو گورو کہتے ہیں، ہماری بڑی گدی راولپنڈی میں ہے اور بخشو کی گدی کہلاتی ہے اس گدی کی آمدنی خاصی ہے، یوں کہیے

سونے میں تلتی ہے عام جائداد بھی خاصی ہے،

دوسری گدی لاہور میں ہے —— ہیرا منڈی کے علاقے میں —— اس کو بابا رکھا کی گدی کہتے ہیں۔"

"لیکن اس گدی میں تو سبھی کچھ چلتا ہے!"

"یہ سبھی کچھ کیا ہے؟" —— شوکت نے بات اُٹھاتے ہوئے کہا "سبھی کچھ کہاں نہیں چلتا؟ کیا زندگی کا کوئی گوشہ خالی ہے"؟

شوکت کے لہجہ میں خود اعتمادی کا عنصر شامل تھا، اُس نے بتایا۔

آپ لوگ ہمیں حقارت سے دیکھتے ہیں ہمیں پوچھئے کہ معاشرہ کی حالت کیا ہے، لوگوں کی اخلاقی حالت کہاں سے کہاں نہیں آپہنچی؟ جن لوگوں کو آپ محلوں کے آقا اور مسندوں کے وارث کہتے ہیں، ان کا باطن ہم پر روشن ہے میں نے گانے بجاتے ہی میں عمر نہیں گنوائی ہزاروں انسانوں کو قریب سے دیکھا ہے میں ہر انسان کی آنکھ کو پہچانتا ہوں ایک ہی گردش مجھے اس کے مافی الضمیر تک لے جاتی ہے۔"

"ملک بھر میں کتنے مخنث ہوں گے"؟

"شمار تو نہیں کیا لیکن جو ظاہر ہیں ان کی تعداد پانچ چھ ہزار سے کیا کم ہو سکتی ہے۔"

"اور جو پوشیدہ ہیں"؟

"ان کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، خدا ہی بہتر جانتا ہے"۔

شوکت نے اپنے معاشرہ کی رسموں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ جب ہم میں سے کوئی مخنث اپنے چیلے کو نکال دیتا ہے تو کوئی دوسرا اسے لینے کے لئے تیار نہیں ہوتا جب تک پنچایت اپنا فیصلہ نہیں دیتی"۔

"پنچایت کا فیصلہ کبھی تو سینکڑوں روپے جرمانہ تک پہنچتا ہے اور کبھی صرف جوتی میں تیل ڈلوا لیا جاتا ہے"۔

"جوتی میں تیل ——؟"

"جی ہاں! ہمارے ہاں اس کو بڑا عیب سمجھتے ہیں۔ بلکہ ہم لوگ جرمانے کو ترجیح دیتے ہیں"۔

شوکت نے کہا "بعض لوگ ہمارا اڈا انڈا بھانڈوں سے ملاتے ہیں، لیکن اُن کے اور ہمارے درمیان دُور کا ناطہ بھی نہیں، ہم نقلیں نہیں کرتے اور نہ کسی پر پھبتیوں کا جھاڑ باندھتے ہیں۔ ہماری زندگی مستعار فقیرانہ ہے جو لوگوں کو دُعائیں دینے میں گذر جاتی ہے"!

"کبھی تمہاری میّت دیکھنے میں نہیں آئی؟"

وہ ہنسا اور کہا "آپ بھی عجیب سوال کرتے ہیں، معاف کیجئے نہ تو ہم آسمان سے ٹپکتے ہیں اور نہ آسمان پر اُڑ جاتے ہیں، ہمیں بھی ماں کی کوکھ ہی جنتی اور ہمارا جنازہ بھی مرد ہی لے جاتے ہیں"۔

"نماز جنازہ کون پڑھاتا ہے؟"

"مولوی"

"مولوی؟"

"جی ہاں! شوکت نے اس تحیر کو جھٹلاتے ہوتے کہا۔

"کیا ہم ٹکے نہیں دیتے؟ پھر کیا ہم مسلمان نہیں۔ ہمارے دل بھی خدا کے خوف سے لبریز ہیں، ہم بھی اسلام کو مانتے ہیں، پیر فقیر مناتے ہیں، نذر نیاز دیتے ہیں، داتا کی حاضری بھرتے ہیں، گنج شکر کے روضے پر جاتے ہیں، بری امام کے سلام کو پہنچتے ہیں۔ اب تو خیر وہ دن نہیں رہے لیکن زمانہ تھا کہ ہر سال صابر پیا کی چوکھٹ پر اور خواجہ کی نگری میں حاضری بھرتے تھے، ہر گیارھویں شریف کو شرینی بانٹتے ہیں عیدیں آتی ہیں، شب برات آتی ہے، عاشورہ کے دنوں میں پنجتن پاک کا سوگ مناتے ہیں، عید میلاد کو چراغاں کرتے ہیں، آخری چہار شنبہ کو بتاشے بانٹتے ہیں، پھر ہم مسلمان بھی ہیں اور انسان بھی، ہمارے ہاں کبھی فرقہ دارانہ جھگڑے نہیں ہوتے، نہ کبھی انسانوں کے خون سے ہاتھ رنگے جاتے ہیں، نہ کبھی ہم نے سیاسی حقوق کا مطالبہ کیا ہے اور نہ ہمارے کوئی حقوق ہیں، افسوس کہ خدا کی مخلوق سیاسی مخنثوں کے قبضہ میں ہے!"

"اور یہ سیاسی مخنث کون ہیں؟"

شوکت کھلکھلا کر ہنس پڑا ـــــ "معاف کیجئے، انہیں آپ بھی جانتے

یں سیاسی مخلنثوں کی مضرتیں اجتماعی ہیں اور جنسی مخنثوں کی فردی۔ شوکت کے
قہقہے فضا میں اس طرح گھل رہے تھے، جیسے کسی کھوکھلی عصمت کی چتا کا دھواں
خلاؤں میں گھلتا ہو ـــــ دھواں اور قہقہے۔

رات کی بات

عورتیں تصویر ہوتی ہیں اور مرد معمہ، اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ
عورت کا واقعی کیا مطلب ہے، تو اس کی طرف دیکھو، اس کی
سنو نہیں ــــــ آسکر وائلڈ۔

۲۱ اپریل ۱۹۴۸ء کی شب پاکستان میں پہلا یوم اقبال تھا، ادھر یونیورسٹی میں حکیم الامت کے عقیدت مند فلسفہ خودی چھانٹ رہے تھے، اُدھر ریڈیو سے کلام اقبال نشر ہو رہا تھا، اور کہیں کہیں فٹ پاتھ پر خوش لحن فقیر "ساقی نامہ" الاپ رہے تھے ــــــ

ــــــ گیا دَورِ سرمایہ داری گیا

خان کو اصرار تھا کہ ہم اس کی معیت میں آمیر سے ملیں، علامہ اقبالؒ آغاز جوانی میں اس آمیر ہی کی آواز کے معترف تھے اور یہ حُسنِ اتفاق تھا کہ آج اس کے ہاں کسی تقریب کا اہتمام تھا، سب پشتینی رنڈیاں اس کے ہاں

مدعو تھیں۔ امیر کی بیٹیاں جن کا آفتاب ان دنوں نصف النہار پر ہے، اس ڈار میں خوبصورت کبوتریوں کی طرح غٹرغوں غٹرغوں کر رہی تھیں۔ تمام احاطہ بقعہ نور بنا ہوا تھا جیسے السپرادس کا کوئی غول ستاروں سمیت کرۂ ارضی کی اس ٹکری پر اتر آیا ہو۔ ع

آج کی رات اُف او میرے خدا آج کی رات

امیر چھیاسٹھ برس کے سن میں ہے ممکن ہے کبھی خوب رُو ہو، مگر اب عمر رفتہ کا ایک جھوٹا جھول ہے۔ بانظر یہ ظاہر چمڑی ہوئی ہڈیوں کا ایک ڈھیر، جس میں دھوئیں کی سڑاندرہ گئی ہے، رنگ سنولا چکا بلکہ سیاہ ہوتا جا رہا ہے۔ بال سفید ہو چکے ہیں، دانتوں میں کھڑکیاں نکل آئی ہیں، اور لہجہ مریل ہو چکا ہے۔

الہٰی جان نے کہا، "خالہ یہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں" امیر نے آنکھیں کھول دیں، گویا کسی بھولی بسری حکایت کا تعاقب کر رہی ہیں، ہم نے سوال کیا تو اس کے بوڑھے چہرے کی جھریاں مسکرائیں، جیسے کسی گمشدہ کہانی کے الفاظ بکھر گئے ہیں اور وہ انہیں اکا اکی جوڑ دینا چاہتی ہے۔ اقبال کے نام سے اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں ایک نور سا جاگ اٹھا، لیکن بسرعت مدھم ہو گیا، گویا ایک بیپ سو شکھر۔

اس نے کچھ بتانا قبول نہ کیا، ہمارا اصرار بڑھا تو قدرے جھنجھلا کر کہا ——

"ہمارے ہاں مُردوں کے کفن پھاڑنے کا رواج نہیں، انسانی گوشت

کی چاٹ بڑی ہوتی ہے، ایک دفعہ مُنہ لگ جائے تو شراب کے نشہ سے بڑھ
خوار کرتی ہے، اس عمر میں انسان کو خوفِ خُدا کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا۔ جب
خُدا کا خوف نہیں تھا تو سب کچھ یاد تھا۔"

ہم نے بات کو طول دینا چاہا، اور تقاضا کیا کہ وہ ان صحبتوں کی کوئی کہا
چھیڑے، جب اقبال، عبدالقادر، گرامی، ناظر وغیرہم حاضر ہوتے تھے، لیکن
اُس نے کھوکھلے قہقہوں میں ہمارے استفسار کو سمیٹا، پھر ذرا ترش ہو کر
"خطائے بزرگاں گرفتن خطاست۔ مَیں کوئی کتاب نہیں کہ اُٹھایا ورق پلٹ
جس صفحہ یا پیرے پر نظر ٹھہری اس کو کھنگالنا شروع کیا، پُرانی باتیں وقت
ساتھ مر چکی ہیں، ان رازوں ہی کی ٹوہ میں رہیئے جو زندگی میں راہنما ہو سکے
ہیں ان باتوں کی کھوج سے فائدہ؟ جو آپ کو تو نفع نہیں دے سکتیں لیکن دو
کو محض اس لئے نقصان پہنچا ہو کہ آپ کے کان اس ذائقہ کے عادی ہو چکے
یاد رکھئے ہم لوگ راز فروشی نہیں کرتے یہ کام شریفوں کا ہے۔"

ہمیں یقین ہو گیا کہ امیر اس معاملہ میں سرِّ خفی ہے گو اُس کا رُوپ مر چکا
لیکن اس کی آن نہیں مری، اس کی خودی زندہ ہے۔

ابھی تقریب کا رنگ نہیں بندھا تھا، ایک طرف اُستاد جی حُقّوں
دھوآں اُڑا رہے تھے، دوسری طرف رنڈیوں کی رنگا رنگ آوازیں ایک
دوسرے سے بغل گیر ہو رہی تھیں۔ شب کا پہلا پہر تھا اور مدعوین عمو

رات کے نصف ثانی میں جمع ہوتے ہیں ــــ قاضی نے کہا چلو اتنے میں نایاب کے ہاں ہو آتے ہیں، ہمارے ایک دوست جو نامور باپ کے بیٹے اور خود بھی نامور تھے، اس طرح گھومنے پھرنے کے خلاف تھے اور اُن کا خوف بڑی حد تک جائز تھا وہ محض چوری چھپے کا تماشا دیکھنے کے لئے چلے آئے تھے، اور اس میں بھی زیادہ تر امیر سے ملاقات کا شوق تھا۔ بالآخر مان گئے اور جب بکھراج منزل کی دہلیز پر قدم رکھا تو ان کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ نایاب ریشم کے ڈھیر کی طرح سامنے آ بیٹھی، اس نے خندہ پیشانی کے ساتھ آداب عرض کیا، ان حضرت کی آنکھیں بھی چندھیا گئیں۔ خواجہ سے کان میں کہا "بھائی بزرگوں نے غلط نہیں کہا کہ معصیت میں بڑی دلکشی ہوتی ہے"۔

اِن گھروں میں گاہکوں کی کھسر پھسر کو ناگوار سمجھا جاتا ہے۔ نایاب کی نانی جس کی عقابی نظریں گاہکوں کے تیوروں سے ان کی غایت پہچان لیتی ہے، اس سرگوشی پر کہاں چوکتی، ایک برجستہ فقرہ کسا، غالباً کرخنداروں کے ہاں کا کوئی محاورہ تھا اور گلوری بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیجئے شوق فرمائیے"۔

خواجہ نے کہا ــــ "آپ نے غالباً زندگی میں پہلی دفعہ یہ چوکھٹ دیکھی ہے؟"

نائکہ نے قطع کلام کیا "جی ہاں تو ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے ــــ عمر

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

"محض ہمارے اصرار پر یہاں تک چلے آتے ہیں ورنہ ان کے لئے یہاں دلبستگی کا کوئی سامان نہیں ان کا اوڑھنا بچھونا تو کتابیں ہیں"، خواجہ نے کہا۔

"جی ہاں، وہ تو ان کا چہرہ بول رہا ہے، اوڑھنا بھی کتابیں اور بچھونا بھی کتابیں"۔ اس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا، لیکن بڑھیا نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"میاں! یہ حجاب اولیٰ زیادہ دیر نہیں رہتا، ان بازاروں میں ہرن بھی چوکڑی بھول جاتے ہیں، کون ہے جو اس شاہراہ سے نہیں گذرا، جن لوگوں کی عزت ایک اجتماعی سرمایہ یا قومی ملکیت ہو وہ بھی عمر کے کسی موڑ میں اس کوچہ کی آب و ہوا سے ضرور مستفید ہوتے ہیں، یہ بھول سر راہ سہی لیکن بھول تو ہیں، معاف کیجئے پنجاب میں تو طبیعتوں کا رجحان قدرے مختلف ہے، اور لوگ ہم نشینی کی بجائے ہم جنسی چاہتے ہیں، مگر اُدھر دہلی و لکھنؤ میں بڑے بڑے شرفا مجلس آرائی کے لئے آتے تھے ——— سر سید کانوں کے رسیا تھے، انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد رکھا تو کلکتہ کی ایک جانی پہچانی طوائف نے انہیں چندہ میں بہت سا روپیہ دیا تھا، مولانا شبلی مرحوم کی ثقاہت میں کسے کلام ہوگا لیکن وہ بھی آواز پر مرتے تھے، اکبر الہ آبادی نے تو اپنے گھر میں ایک طوائف ہی کو لبسا لیا تھا، نواب نصیر حسین خیال بھی ایک زندہ دل

انسان تھے۔ غرضیکہ اُس دور کا ہر شاعر یا ادیب ان مکانوں کی سیاحت کر چکا ہے، اِدھر سیاسی راہنماؤں میں مولانا محمد علی مرحوم و مغفور جب کبھی کلکتہ جاتے یا لکھنؤ میں مہاراجہ محمود آباد کے ہاں قیام ہوتا تو زہرہ و مشتری کے ہاں بھی ایک آدھ نشست جما لیتے تھے، چونکہ مَن اُجلا تھا، اس لئے اس میں کوئی عیب نہ دیکھتے تھے حکیم اجمل خاں کے زہد و ورع پر اُنگلی رکھنا خود ایک عیب ہے، لیکن تحریکِ خلافت کے دنوں میں بھی وہ کبھی کبھار خوش وقت ہو لیتے تھے، اور پھر ان کے ہاں جو لوگ جمع ہوتے تھے ان کے علم و نظر کی مثال پورے ملک میں عنقا ہے زمانہ زمانہ کی بات ہے، اُس زمانے میں ہم لوگ ایک ادارہ کی حیثیت رکھتے تھے، اب ہماری حیثیت ایک اڈے کی سی ہے، ظاہر ہے کہ اڈوں پر انسانی آبرو زنگ کھا جاتی ہے"۔

"تو آپ نے ثابت یہ کیا کہ آپ کے مکانوں کو بڑے بڑے لوگ نوازتے رہے ہیں"۔

"آپ کا فقرہ قدرے پہلو دار ہے، میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ بڑی بڑی ہستیوں کے سوانح حیات میں بہت سے ورق نہ سہی چند صفحے ہی سہی، چند صفحے نہ سہی، کچھ حواشی ہی سہی"۔

! ـــــ ان کے تعلقات کا واحد معیار روپیہ ہے، روپیہ کے بل پر آپ

ان کے ہاں شب و روز محفل لگائیں تو انہیں اعتراض نہیں ہوگا، یہ ان کا پیشہ ہے۔ وہ روپیہ اور وقت تبادلہ کی جنس خیال کرتے ہیں۔ یہ "ملازم" ہو کر بھی "رقص و نغمہ" کی دوکانداری میں آزاد ہیں۔ شب کو تشریف لے جائیے، گانا سُنیئے، گرہ کھولئے، روپیہ نہ رہے تو اُٹھ آئیے۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں کوئی تیسری راہ نہیں وہ لوگ "سادہ تعلقات" کے قائل ہی نہیں، اور نہ انہیں مجلسی تعلقات کی ضرورت ہوتی ہے، آپ نے "قدم رنجہ" فرمایا، نائکہ نے تنقیدی شکنوں سے استقبال کیا۔ سازندوں نے کن انکھیوں سے تاکا "مغنیہ" نے رداجاً آداب عرض کیا، آپ نگاہ میں جچ گئے تو چائے حاضر ہے، لیمن حاضر ہے، پان حاضر ہیں، دو چار رسمی فقرے بھی "حاضر" ہیں، اور اگر جچے نہیں تو پھر ظاہری بیتاؤ بھی غائب، گانا سُنیئے، پیسے دیجئے۔ سلام علیکم وعلیکم السلام، بالخیر شما بسلامت ——— اور یہ چند منٹ کی رسمی گفت گو سازوں کی تیاری تک ہوتی ہے۔ طبلے پہ تھاپ پڑی، مغنیہ نے اُنگلیوں سے غیر مرئی بول کا دائرہ باندھا، قہقہے منقطع ہو گئے اور نغمہ چھڑ گیا

فاریاب کی حنائی انگلیاں ستار تک پہنچ چکی تھیں، اُس نے ستار کے لہجہ میں بہت کچھ کہا، ہم میں سے کوئی بھی ستار کی زبان نہ جانتا تھا، اتنا معلوم تھا کہ اس کے موجد امیر خسرو تھے اور تار میں باج کی آواز مدھم سُر سے ملائی جاتی ہے۔ دو پیتلی تار کھرج کی سُر رکھتے ہیں، چوتھا تار فولادی پنچم کا سُر نکالتا ہے پینل کے لرز کا تار سپتک

کے پنچم کی سُر نکالتا ہے۔ دو نو چکارے کھرج کی آواز دیتے ہیں اور باج کے علاوہ جو تار ہوتے ہیں وہ اس کا کام دیتے ہیں، آہستہ آہستہ دھیمے دھیمے سُروں میں ایک آگ سی سُلگتی گئی، اور دیکھتے دیکھتے شعلہ جوالہ بن گئی۔ ہمارے نزدیک یہ ستار کے تاروں کا کمال نہ تھا، بلکہ اُن حنائی اُنگلیوں کا جادو تھا جو پیتل کے تاروں میں ڈھلتے ڈھلتے نغمہ بن گیا تھا —— آبشار سیمیں۔

نایاب کی پیشانی پر قطرے ڈھلک رہے تھے، المحمدی نے کہا، "ان تاروں میں جان پیدا کرنے کے لیے بھی رُوح صرف کرنی پڑتی ہے، جہاں شاعر کا ذہن سوچتا ہے، وہاں مغنیہ کی انگلیاں بولتی ہیں۔"

نایاب نے داغ کی غزل چھیڑی، حافظ نے روک دیا، خواجہ نے کہا "اقبال گاؤ۔" نایاب نے ذہن کے کسی گوشے میں نقب لگائی، ماتھے پر بل ڈالا اور بول اُٹھایا ؎

کافر گیسوؤں والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حُسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

قاضی نے وہیں کاٹ دیا، یہ شعر اقبال کا نہیں ساغر نظامی کا ہے۔

نایاب نے کچھ اور سوچنا چاہا، پھر معذرت چاہی۔

"معاف کیجئے، اس وقت ذہن میں اقبال کا کوئی شعر نہیں آرہا ہے۔"

"جی ہاں یوں بھی آپ کی طرف کے لوگ اقبال سے جی چراتے ہیں۔"

"جی نہیں، مَیں نے تو پنجابی گیت بھی یاد کئے ہیں"۔

"عقیدتاً یا ضرورتاً" قاضی نے طنز سے پوچھا۔

"جیسا آپ خیال فرمائیں"۔

الحمدی نے بات کا رُخ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میاں ضرورت کیا کچھ نہیں کراتی، یہ جو ہم ہرکہ ومہ کے نوکِ زباں ہیں، کیا یہ ضرورت نہیں۔ یہ بھی تو ضرورت ہی ہے، نائیڈو دنایاب کا مخفف) بچہّ ہے، ابھی پکے راگ سیکھ رہی ہے، یہی کوئی دس بارہ غزلیں اور وہ بھی آپ ایسے کرم فرماؤں کی یاد کر لی ہیں۔ انہیں گالیتی ہے"۔

تھوڑے دن ٹھہر جائیے، کلامِ اقبال بھی حفظ کرلے گی۔

"فریدہ کے ہاں چلو، اس کی آواز کا خاصا چرچا ہے"۔

"لیکن وہ تو مدیروں کی نہیں، وزیروں کی ہے۔ آج کل سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔ عُشّاق نے اس کی عادتیں بگاڑ دی ہیں"۔ اسمٰعیل نے کہا،

"تو کیا وہ اس تقریب میں نہ ہو گی"؟ قاضی نے استفسار کیا۔

"ہونا تو چاہیئے لیکن ہم لوگ وہاں کیونکر بیٹھ سکتے ہیں، ان میں یا تو وہ لوگ بیٹھیں جن کی جیب بھری ہو، یا وہ جائیں جن کی غیرت مری ہو"۔ خواجہ نے کہا۔

"لیکن خان نے تو علیحدہ انتظام کر رکھا ہے، اُوپر بالکونی میں چق لگا دی گئی ہے"۔

"چلتے ہیں، جیسی فضا ہوگی ویسا طے کر لیں گے، یوں بھی بارہ بجے شب سے پہلے ایسی محفلیں کہاں منعقد ہوتی ہیں۔ ہمیشہ اس قسم کی تقریبیں آدھی رات کو شروع ہوتی ہیں۔ پہلی نصف رات تو ہر بائی کے اپنے کاروبار کی ہوتی ہے۔"

ممتاز نے پکارا — "آغا جی، آپ کہاں پھر رہے ہیں، آیئے نا، خالہ وزیر بیٹھی ہیں، وہ آپ کو پوچھ رہی تھیں۔"

"آج تو آپ کے ہمسایہ میں جشن ہے، کیا آپ لوگ نہیں جا رہے ہیں"؟

"جی ہاں! اس جشن کے لئے تو شہناز نے سلمیٰ کا نیا سوٹ سلوایا ہے، وہ دیکھئے نا ذوق کے قصیدوں کی طرح بوجھل ہو گئی ہے۔"

اور یہ ممتاز کا خاص رنگ ہے۔

وزیر، ممتاز بادے والی کی ماں، آٹھوں گانٹھ کمید اور ایک کھری نائکہ ہے، اس کے چہرے کی ہر تیوری میں بہت سی کہانیاں خوابیدہ ہیں، اس کی آنکھوں میں ابھی تک ماضی کی دمک ہے، آواز میں بھی کھنک ہے، بدن ڈھلک گیا ہے، لیکن رنگ کی ڈلک باقی ہے، لہجہ میں تمکنت ہے۔ وزیر نے گامے سے کہا حقہ لاؤ حقہ آگیا، اور نے کو منہ سے لگا کر یوں بیٹھ گئی جیسے کوئی بانکا چودھری گدی پر بیٹھے بیٹھے گھوڑیوں کی سوداگری کرتا ہے۔"

"آغا جی کہیئے طبیعت کیسی ہے"؟

"خدا کا شکر ہے آپ کی طبیعت کیسی ہے"؟

"بس خدا کا احسان ہے، جو بیت چکا ہے اس کا غم نہیں، جو بیت رہا ہے اُس کا گلہ نہیں، جو بیتنے والا ہے اُس کی فکر نہیں، اس چل چلاؤ کا نام ہی زندگی ہے۔"

"ممتاز آپ کی بہت تعریف کرتی ہے، کبھی یہ تو فرماتیے کہ جو زمانہ بیت چکا ہے اُس کی یادیں بھی آپ نے محفوظ رکھی ہیں۔"

"جی ہاں! یادیں ہی تو باقی رہ جاتی ہیں اور اب تو ایک آہ سرد کے سوا کچھ باقی نہیں رہا —— آپ جانتے ہیں زندگی میں جو لمحے یاد رہنے کے قابل ہوتے ہیں وہی ہیں جو بسر کیے جا چکے ہیں۔"

ابو یوسف نے کہا: "یہ تو آسکر وائلڈ کا مقولہ ہے۔"

ممتاز نے بات اُچک لی اور چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں، خالہ وزیر بھی تو پچھلی جون میں سائرہ تھیں۔"

وہی قہقہے —— حُسنِ اتفاق سے صابری بھی آگئی، قاضی کہہ رہا تھا

"ممتاز کو سمجھنا بڑا ہی مشکل ہے۔"

صابری نے کہا، "کیوں یہ بھی کوئی بجھارت ہے۔"

"بجھارت نہیں یہ تو "نارِ دمنی" ہے۔"

"وہ کون تھا؟"

ممتاز نے حسبِ دستور قہقہہ لگایا اور کہا

"قاضی جی کا ہمزلف۔"

وزیر نے کہا، قاضی جی! عورتیں اس لئے نہیں بنی ہیں کہ ان کو سمجھا جائے وہ تو محبت کے لئے پیدا کی گئی ہیں"۔

"ٹھیک ہے لیکن محبت بھی تو ایک جنسی جذبہ ہے"۔

"جی ہاں! ہم اور آپ سب جنسی جذبے ہی کی پیداوار ہیں"۔ ممتاز نے پھر ٹوکا۔

خواجہ نے قاضی سے کہا ــــ "بھائی! ممتاز سے جیتنا سہل نہیں یہ تو ذہانت کی پھلجھڑی ہے"۔

ممتاز نے سگریٹ سلگایا اور وزیر سے کہا۔ "خالہ! یہ اپنی کتاب کے لئے کچھ سوال پوچھنا چاہتے ہیں"؟

"مثلاً"؟" وزیر نے دریافت کیا

مثلاً (ممتاز نے آنکھیں مارتے ہوئے کہا، جوانی کا تجربہ"؟

وزیر کھلکھلائی، جیسے وہ اس کے لئے تیار نہ ہو۔

ممتاز نے حسبِ عادت پھر چٹکی لی اور کہا۔ "تجربہ نام ہے جگ بیتی یا آپ بیتی کا"۔

ابو یوسف نے کہا۔ "جی نہیں آسکر وائلڈ کے الفاظ ہیں ــــ ہم کرتے ہیں غلطیاں اور اس کا نام رکھتے ہیں تجربہ"۔

وزیر نے کہا۔ "بالکل ٹھیک یہی وجہ ہے کہ دنیا ایک دوسرے کے تجربوں سے فائدہ نہیں اٹھاتی ہے، بلکہ ہر انسان نیا تجربہ کرتا ہے"۔

"ٹھیک ہے انسان ہمیشہ ہی تجربوں کی گذرگاہ میں رہا ہے، لیکن یہ آپ کے ہاں بڑی بوڑھی عورتوں کو نائکہ کیوں کہتے ہیں؟"۔

"ماخذ کیا ہے؟ یہ تو آپ ادیب لوگ ہی جانتے ہیں، لیکن جب رنڈی بوڑھی ہو جاتی ہے تو اس کو نائکہ کہتے ہیں"۔

"ممکن ہے یہ نائک کی تانیث ہو"۔ ممتاز بولی۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے پہلے زمانہ میں جو سپاہی گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکتا تھا اس کو اخیر عمر میں نائک کا عہدہ ملتا تھا۔ یہی حال رنڈی کا ہے، جب وہ اُتارو ہو چکتی ہے تو بوڑھی ہونے پر نائکہ کہلاتی ہے" ——— قاضی نے کہا۔

"لیکن اصل لفظ نائچہ تو نہیں"؟ خواجہ نے کہا۔

"جی نہیں، نائچہ کے معنی ہیں حُقّے کی نے"۔ اسمٰعیل نے جواباً کہا۔

"تو پھر یہ نائچہ ہی ہے (ممتاز نے گفتگو قطع کرتے ہوئے کہا) حُقّے کی نے بھی مُنہ لگی ہوتی ہے اور نائکہ بھی اس رنڈی کو کہتے ہیں جو مُنہ لگ چکی ہو"۔

سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

وزیر نے کہا ——— "آپ بوڑھی رنڈی کا لقب کہہ لیجئے، اس میں قدرے حقارت پائی جاتی ہے، مثلاً آج کل نااہل کو خلیفہ، جاہل کو علامّہ، اناڑی کو اُستادجی اور عطائی کو شفاء الملک کہتے ہیں"۔

"آپ نے کبھی اپنے ماضی پر غور کیا ہے"؟

"جی ہاں، ہر شخص کبھی نہ کبھی اپنے ماضی پر ضرور سوچتا ہے، لیکن اس پر پچھتانا فضول ہے، ہمیں زندگی کے سبق اس وقت ملتے ہیں کہ ہمارے لئے بیکار ہو چکتے ہیں، ان گمشدہ دنوں کے لئے تلملانا لے سود ہے۔ ماضی اور حال میں چنداں فرق نہیں، محض احوال وظروف ہی بدلتے ہیں، جہاں تک اسباب ونتائج کا تعلق ہے وہ ہمیشہ ایک ظاہری فرق کے ساتھ یکساں رہتے ہیں۔ صدیوں پرانے انسان میں اس کے سوا کوئی تبدیلی نہیں آئی کہ اس نے وقت، فاصلہ اور زمین کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔ اس کی تبدیلیاں جسم کی ہیں، رُوح کی نہیں، اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف "میک اَپ" کا ہے، زندگی یا تو مشینی ہوگئی ہے یا کاروباری باقی نفع وضرر کی خصوصیتیں پرانی ہی ہیں۔"

——— وزیر کی ان باتوں نے ہم سب کو متاثر کیا، گو اس کے الفاظ اتنے صاف نہ تھے لیکن اس کی باتوں کا مفہوم اس سے بھی زیادہ واضح تھا۔

"آپ نے کچھ پڑھا بھی ہے؟" قاضی نے پوچھا۔

"اگر پڑھنے سے مراد کتابیں ہیں تو سمجھئے کہ حرف اُٹھا لیتی ہوں، البتہ بے شمار انسان ضرور پڑھے ہیں، سینکڑوں انسان! دادی اماں کی کہولت کا زمانہ دیکھا، ماں کی جوانی کا دَور دیکھا، پھر خود ایک دَور بتا کر یہاں تک پہنچی ہوں، بیٹی کا کہ "وفر بھی دیکھا ہے، اور پوتیاں بھی آنکھوں کے سامنے چوکڑی

بھر رہی ہیں، گویا پانچویں پشت سے انسان پڑھ رہی ہوں، مگر معاف کیجئے، مرد کا عشق محض دھوپ کا تڑاقا ہے۔"

"اور عورت کا عشق ؟" خواجہ نے سوال کیا

"عورت کا عشق، ممکن ہے آپ کوئی پھبتی کسنا چاہیں، لیکن یہ کبھی نہ بھولئے کہ عورت محض جذبات پر جیتی ہے، وہ زندگی میں ایک ہی دفعہ محبت کرتی ہے، بار بار نہیں، اگر اُس کی محبت اُس سے دغا کرتی ہو، تو پھر وہ محبت نہیں کرتی، انتقام لیتی ہے۔"

"اور کسبی" ؟ قاضی نے دریافت کیا،

وزیر کا چہرہ کسبی کے لفظ سے دمک اٹھا ——— اور گونجدار آواز میں کہا، "کسبی ——— ! کسبی مردوں کی فسطائیت کے خلاف ایک احتجاج ہے۔"

"احتجاج یا انتقام"

"کچھ کہہ لیجئے، لیکن الفاظ بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی"

اگر آپ کی رائے تسلیم کر لی جائے تو یہ احتجاج یا انتقام خود عورت ذات کے لئے ہتک کا موجب ہے"

امتیاز نے بات کو کاٹتے ہوئے کہا" ہتک کا موجب نہیں اذیت ناک ہے آپ عصمت فروشی کو انتقام یا احتجاج کہہ رہے ہیں خدا کا قہر ہے"۔

ممتاز نے کہا،" کیا رام کہانی لے بیٹھے ہیں آپ ؟ اس تھکا فضیحتی پر صلواۃ

بھیجئے۔

"ملاحظہ فرمائیے، یہ الفاظ کا تنزل ہے۔ آپ ہیں کہ عورت کے تنزل پر ہلکان ہو رہے ہیں، کہاں رام کہانی اور کہاں صلوٰۃ؟ اور کہاں یہ متبذل مفہوم"؟ قاضی نے بات کا رُخ پھیرتے ہوئے کہا —— اور ممتاز لقمہ دیتے ہوئے بولی۔

" اس قسم کے تو کئی الفاظ ہیں، مثلاً لن ترانی ہے، اب ڈینگ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کسی نے کبھی "یارِ غار" پر غور نہیں کیا، کہ اس کی خصوصیت کیا ہے؟ غالب نے غلط نہیں کہا تھا ؎

غلطیہائے مضامین مت پوچھ

لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اب رات کا نصف قریب تھا، جو لوگ اہم فلم تھے وہ پھیرے لگا کے جا چکے تھے، کچھ اللّے تلّے اِدھر اُدھر تاکتے جھانکتے گذر رہے تھے۔ بعض "کن رسیے بنا ہیں" چاہ رہے تھے، کہیں کہیں چوباروں میں آوازکی قرنا پھونکی جا رہی تھی، اور کئی شراب میں بدمست واہی تباہی بکتے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

تقریب شروع ہو گئی۔ بیٹے کا شگن تھا، لیکن منچلوں نے اس کو بھی "یومِ اقبال" سے تعبیر کیا، ایک طرف صوفہ سیٹ تھے، ان پر "خان زادے" اور ان کے احباب فروکش تھے۔ دوسری طرف عام مدعوین قالینوں پر کھلے بیٹھے

تھے، ایک کونے میں اُستاد جی حاشیہ لگانے میں مشغول تھے۔ اور اُدھر سامنے کے رُخ پر طلوا تفین بیٹھیں تھیں اُن کے دمکتے ہوئے چہروں کی یکجائی پر دیپ مالا کا قیاس ہوتا تھا، یہ کوئی پچاس کے قریب تھیں لیکن ایک کالباس دوسرے پر بازی لے گیا تھا جن کا سن بیت چکا تھا وہ بھی چکارا نظر آتی تھیں، ان کو دیکھ کر خیال آتا تھا کہ یہ عورتیں نہیں سونا ہیں، ہمارا ملک زرعی نہیں زرّی ہے ہم کسی متمول ملک کے باشندے ہیں، یہاں کوئی بھوکا ہے نہ ننگا۔ ہر کہیں رزق اور روپے کی فراوانی ہے، کوئی شخص خون نہیں پیتا، سب شراب پیتے ہیں۔

ممتاز اپنی ہمجولیوں میں (CORRECTION SLIP) بنی بیٹھی تھی ہمارے پاس بالکونی میں آگئی اور بتایا ـــــ "وہ صاحب جن کے سیاہ چہرے پر برص کی دھاریاں پھیلی ہوئی ہیں، پہلے فریدہ کو گوانا چاہتے ہیں۔"

"یہ کون بزرگ ہیں؟"

"بزرگ کہاں ہیں، برخوردار ہیں! ماں کی گود سے قسمت کے دھنی ہیں۔ پاکستان راس آگیا ہے ـــــ چہرے سے تو معلوم ہوتا ہے جیسے کسی بچے نے سلیٹ پر چاک سے لکیریں کھینچ دی ہیں۔"

"جی نہیں، فریدہ سے پوچھئے، ان کے میاں ہیں، وہ کہا کرتی ہے۔"

"آبنوس پر ہاتھی دانت کا کام ہے۔"

"اچھا اِن میں کون کون اچھی گویا ہے؟"

"آپا مختار اور آپا شمشاد"۔

"لیکن وہ تو ڈھل چکی ہیں"۔

"عمر کی بات اَور ہے، لیکن آواز تو اب بھی جوان ہے، سچ پوچھیے تو یہ دونوں صدا ہیں اور باقی جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں وہ بازگشت ہے"۔

فریدہ نے بول اٹھایا ؎

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا
بوئے گُل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ایک گوشہ سے آواز آئی، "اس حُسنِ اعتراف کا شکریہ!

"جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا"۔

سو روپیہ کا نوٹ، ایک نوٹ، دو نوٹ، کئی نوٹ، ایک نے دس روپے کا نوٹ دکھایا، لیکن اس نے آنکھیں پھیر لیں، دو نوٹ، پہلو بدل لیا۔ تین نوٹ، پیٹھ کر لی۔ وہ بھی منچلا تھا، دس دس کے دس نوٹ طاؤس کے پَروں کی طرح پھیلا دیئے، فریدہ نے مسکراہٹ کے ساتھ سمٹتے ہوئے کہا، "آج کل مندا ہے جیب ہی میں رکھ لیجئے"، اُس نے اس طعن کو گالی سمجھا،

جیب سے سُرخوں کی تھئی نکالی اور پاؤں میں بکھیر دی ـــــ نوٹ ہی نوٹ !

> ## بینک دولت پاکستان ـــــ
>
> حکومت پاکستان کی ضمانت سے جاری ہوا ـــــ
>
> **دس روپیہ**
>
> زاہد حسین
>
> گورنر
>
> بینک دولت پاکستان
>
> مَیں وعدہ کرتا ہوں کہ حامل ہٰذا کو جس دارالاجرا سے
> وہ چاہے عندالطلب مبلغ دس روپے ادا کر دوں گا :

اب فریدہ نے گھنگھرو باندھ لئے، اس کی آواز کا لہرا ہوا کے بازوؤں پر لہرا رہا تھا۔ ایک غزل کے بعد دوسری غزل سے

تم مِرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی

تیسرا نہیں ہوتا ـــــ ایک نوجوان نے درمیان میں سے کاٹ ڈالا، فریدہ کلامِ اقبال پر آ گئی ـــ

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نَے نوازی ـ میں ایک گدُاز تھا

اس مصرع کو پلٹ کر دُہراتا تاثر کی تھاہ تک پہنچ گیا اور پھر مصرع اولیٰ کے نصف اوّل —— وہی میری کم نصیبی —— کو جس انتہا پر لے جا کر جس آہنگی سے لوٹایا، اس میں ایک ایسا بہاؤ تھا کہ سامعین لوٹ پوٹ ہو گئے۔

چہ رامی زند ایں مطرب مقام شناس
کہ درمیانِ غزل قول آشنا دارد

اُس نے ایک ہی بول میں کئی حکایتیں کہہ ڈالیں، گو اُس کے جسم کا ایک ایک ٹانکہ بول رہا تھا اور اُس کی پلکوں کے تناؤ میں معانی کا ذخیرہ تھا لیکن کوئی جوہر مفقود تھا، تو وہ نسائیت کا جوہر تھا۔

فردوس نے پہلے تو حاضرین کا جائزہ لیا، پھر "ابھی تو مَیں جوان ہوں" گانا چاہا، لیکن حاضرین نے اصرار کیا —— اقبالؔ

تیور بدلے، اور زاویہ سا بناتے ہوئے فردوس نے بول اُٹھایا ـــ

نگاہ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

آواز میں کندن کی سی دمک نہ ہونے کے باوجود آواز کا چکمہ ضرور تھا۔ ہر

شعر معذرت کے لہجہ میں گایا اور ہر نوٹ تشکر کے ساتھ وصول کیا، لیکن اس کے اعضاء کی لچک سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان ٹہنیوں کی آب مر چکی ہے، اگر کوئی شے باقی ہے تو وہ ایک خوبصورت خول ہے جس میں شب بسریوں کے بہت سے جوڑ ہیں۔

عنایت بائی ڈھیرو والی نے غزل چھیڑی ؎

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

اور جب مقطع پر پہنچی تو رنگ ہی دگرگوں تھا ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

ایک دوسری غزل نے محفل لوٹ لی، مطلع تھا ؎

دِل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے

مقطع تھا ؎

کیا صوفی و ملّا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

عنایت نے صوفہ نشینوں کے گریبانوں پر حنائی انگلیوں کا نشانہ باندھا اور مصرع اولیٰ کو پلٹتے ہوئے قدرے لوچدار آواز میں ــــ کیا صوفی و ملّا کو ــــ

اور قدرے گونجدار آواز میں ——— خبر میرے جنوں کی دہرایا، تو اس ادا پر محفل کی محفل نثار ہو گئی، اِدھر اُدھر سے نوٹوں کی برکھا ہونے لگی، ایک بالا بلند نوجوان نے گریبان پھاڑ ڈالا، ہر چاک پر سو سو روپے کا نوٹ رکھ کر نذر کیا ———

جی ہاں ذرا ایک دفعہ پھر ———

کیا صوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

ممتاز نے بھی اقبال ہی سے شروع کیا ؎

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

یہ شعر مدعوین کی ذہنی استعداد سے بہت بالا تھے، لیکن سادہ سی غزل سے اس کی دھاک بیٹھ گئی، چونکہ نئی ہے، لہٰذا آواز کا جوار بھاٹا سہ آتشہ ہو گیا ؎

زندگی کے اُداس لمحوں میں — بے وفا دوست یاد آتے ہیں
خوش رہو اے حسین انسانو — راستے جگمگائے جاتے ہیں

رہوارِ شب سرپٹ دَوڑ رہا تھا، لیکن رنڈیوں کے قہقہے، اور سگریٹوں کا دھواں اس سے بھی تیز رَو تھے، ممتاز گا چکی تو ایک کونے سے آواز آئی "مختار" مختار نے سُنا تو اس کا چہرہ کِھلکِھلا اُٹھا، گویا سراپا تشکر ہے، پہلے آواز کو

پکے راگ سے کھنگالا، پھر جشر کی غزل گائی ؎

چوری کہیں کھُلے نہ نسیمِ بہار کی
خوشبو اُڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی

اس کی آواز میں ابھی تک صُبحِ جوانی کا نُور ہے، لیکن زندگی شامِ غریباں تک آ پہنچی ہے ایک طوائف اس وقت بیوہ ہو جاتی ہے جب جوانی بیت چکتی ہے، اور یہ احساس مختار کی آواز سے بھی جھلک رہا تھا، وہ جانتی ہے کہ اب وہ ایک آواز ہے جس کی لذت محض کانوں کے لئے ہے اور اس کا بدن پان کا پتہ ہے جو پک چکا ہے، اور اس پر بھی تمت بالخیر کی مُہر لگ گئی ہے۔

ایک عورت کے لئے اس سے بڑھ کر صدمہ کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ وہ بوڑھی ہو گئی ہے، یا اس کا حُسن مر چکا ہے، عورت ہمیشہ عمر کی زیادتی سے گھبراتی ہے جو عورت اپنی صحیح عمر بتا دے، سمجھئے کہ وہ اپنی غلطیوں میں کوئی دلکشی پیدا نہیں کر سکتی۔ پھر ایک طوائف جو آہ بن کر اُٹھتی اور آنسو بن کر گرتی ہے۔

شمشاد نے (جس کی عمر اب تھک چکی ہے) پہلے تو عذر چاہا، لیکن ہمجولیوں کے اصرار پر راضی ہو گئی۔

قیوم نظر کی غزل ؎

زندگی چال چل گئی شاید — موت بھی آ کے ٹل گئی شاید

اور پھر —— اقبال

اگر کچھ ردّ ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

معلوم ہوا جیسے آواز میں جوانی گا رہی ہے لیکن اُس کے چہرے کے شہابی رنگ پر یہ سوال پھیلا ہوا تھا کہ زندگی بڑھاپے سے شروع ہو کر بچپن پر ختم ہو جاتی تو کیا ہوتا؟

اس کی آواز اور وقت دونوں اُڑتے جا رہے تھے، اور اب تو فضا کا رنگ ہی بدل گیا تھا صوفہ نشینوں کی وضعداریاں ڈھیلی پڑ گئی تھیں، پیالوں کے سُرخ پانی نے حواس کا توازن ہِلا دیا تھا۔

ایک عجیب و غریب شور میں شہناز نے ناچنا شروع کیا۔ کلائی سے کلائی پر گرہ باندھی، ایڑیاں ٹھمکائیں، آواز آئی ــــ "پنجابی"

بڑے اچھے ہاتھ پاؤں کا ایک جامہ زیب نوجوان سامنے آ بیٹھا، غور سے دیکھا، اچکن کی جیبیں ٹٹولیں، دو سبزے پاؤں پر نچھاور کیے اور کہا "شہناز پنجابی!" ــــ ع دل تیرے پیار دیاں پاندا اے کہانیاں

شہناز نے دُور آئینہ پر ایک نظر ڈالی کہ اس کی لم چھڑی آنکھوں میں اَن کہے خیالوں کی بتیاں جھلملا رہی تھیں، اِدھر دائرہ بنا، اُدھر ہاتھوں کے گجرے حرکت میں آ گئے، بوٹی بوٹی تھرکنے لگی، ایک قوس کہ جس پر نام کی کوئی سی تہمت بھی دھری نہیں جا سکتی ہے اس کا رقص رات کے گھنے پن میں اور

بھی گھنا ہو گیا، زاویے ہی زاویے —— دائرے ہی دائرے ——

دل وِچ درد اے، تے اکھاں وِچ اتھرو

سانبھ سانبھ رکھیاں نے تیریاں نشانیاں

دل تیرے پیار دیاں پاندا اے کہانیاں

(دل میں درد ہے، اور آنکھوں میں آنسو، اے محبوب! مَیں نے تیرے پیار کی نشانیاں بڑی حفاظت سے رکھ چھوڑی ہیں۔ اس لئے کہ دل تیرے پیار کی کہانیاں کہتا ہے)

اُس کا ناچ تیز ہوتا گیا، اس کی دُھنیں پھیلتی گئیں، اس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا، اس کی ادائیں نکھرتی گئیں، اس کے پھُول کھِلتے گئے، اس کے شعلے ٹوٹتے گئے، اس کا رُوپ سوا ہوتا گیا۔ اس کی جوانی کا الاؤ بھڑکتا گیا، کبھی لہروں کی طرح بڑھی، کبھی پنکھڑیوں کی طرح سمٹی کبھی خوشبو کی طرح پھیلی، کبھی بجلی کی طرح کوندی، کبھی مینا کی طرح چھلکی، کبھی ساغر کی طرح کھنکی، کبھی گلاب کی طرح مہکی، کبھی بُلبُل کی طرح چہکی، کبھی گھٹاؤں کی طرح اُٹھی، کبھی میکدے کو نکل گئی، کبھی بتکدے کو آ گئی، کبھی آغوش بن گئی، کبھی اُمنگوں میں گھُلنے لگی، اور کبھی رنگوں کا پیکر بن گئی —— لیکن جیسے جیسے وہ ناچتی گئی، اس کا ہر زاویہ سوال بنتا گیا —— فرشتوں کا زہر خند —— قدرت کا نوحہ

وہ ناچ رہی تھی، ہم دیکھ رہے تھے۔ ہم دیکھ رہے تھے وہ ناچ رہی تھی،

وقت ناچ رہا تھا، ماحول ناچ رہا تھا، دل ناچ رہے تھے، دماغ ناچ رہا تھا، دَر و دیوار ناچ رہے تھے، چشم و گوش ناچ رہے تھے۔ الغرض فضا میں ناچ ہی ناچ تھا، لیکن یہ ناچ ـــــ بکاؤ ناچ ـــــ سیاست کے ناچ سے کہیں بہتر ناچ تھا، سیاست کے ناچ میں کئی چیزیں ناچتی ہیں، قوم ناچتی ہے، ملک ناچتے ہیں، غیرت ناچتی ہے، حمیّت ناچتی ہے، عقیدے ناچتے ہیں اور ابھی پانچ سال پہلے ہزارہا عصمتیں ناچ چکی ہیں۔ اور یہ ناچ صرف جسم کا ناچ تھا، بیوپار کا ناچ، لین دین کا ناچ، مرد کی جیب اور عورت کے جسم کا ناچ، جس کے ساتھ ضرب تقسیم اور جمع تفریق کا کوئی کانٹا نہ تھا ـــــ ع

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است

رات کا سنّاٹا ختم ہونے کو تھا، اور ستاروں کے قافلے خلاؤں میں ڈوب جانے کو مدہم ہو گئے تھے، شہناز کا جسم تھک چکا تھا، لیکن اقبالؔ نے آواز کو سہارا دے رکھا تھا ـــ

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

اور ـــــ

ـــــ اب بھنگڑہ د پنجابی لوک ناچ، شروع ہو چکا تھا، گھنگھروؤں کے چھناکے، ستار کے لہرے، طبلے کی دھمک تھپک اور پھر ـــــ ستلج کے گیت،

بیاس کے بول، راوی کے راگ، چناب کا ماہیا، اور جہلم کے دوہے

اڈا اڈا دھم، بھنگڑا ——— اڈا اڈا دھم، بھنگڑا

تا تھیا، تا تھیا، تا تھیا ——— اڈا اڈا دھم، بھنگڑا

اڈا اڈا دھم، بھنگڑا ——— تا تھیا، تا تھیا، تا تھیا

؎ رَن نہا کے چھپڑ وچوں نکلی
سلفے دی لاٹ وَرگی

(دوشیزہ جوہڑ میں سے نہا کر نکلی، تو محسوس ہوا کہ عورت نہیں، سلفہ کا شعلہ جوالا ہے)

مینوں پنڈ دی کڑی نہ سمجھیں
وے دساں تینوں رَن بن کے

(مجھے گاؤں کی لڑکی نہ سمجھنا، میں عورت بن کر بھی دکھا سکتی ہوں"، یہ گاؤں کی لڑکیوں کے بھولپن اور عورتوں کے بانکپن کی طرف اشارہ ہے)

؎ میری لگدی کسے نہ ویکھی
تے ٹُٹدی نوں جگ جاندا

(جب میں نے پیار کیا تو سب بے خبر تھے، لیکن جب پیار ٹوٹا تو دُنیا جانتی ہے)

ے اگ بال کے دھوئیں ڈے وچ روواں

تے بھیڑے دُکھ یاریاں دے

(میں آگ جلاکر دھوئیں کی آڑ میں رولیتی ہوں، کیسے کہوں کہ عشق و عاشقی کے روگ کتنے اذیت ناک ہوتے ہیں)

ے میرا یار نی سرو دا بُوٹا

تے وہڑے وچ لا رکھدی

(میرا چہیتا سرو کا بُوٹا ہے۔ کاش میں اسے اپنے صحن میں لگا سکتی)

ے دَمڑی دا سک مَل کے

مُنڈا موہ لیا تویتاں والا

(ایک کوڑی کا ہونٹوں پر دنداسہ مل کر تعویذوں والا لڑکا شکار کر لیا ہے۔ پنجاب میں رواج ہے کہ مائیں اپنے بیٹوں کو نظرِ بد سے بچانے کے خیال سے تعویذ پہنا دیتی ہیں)

ے ماجھے دیئے بند بوتلے

تینوں پین گے نصیباں والے

(شاعر محبوبہ سے کہتا ہے، اے ماجھے (فیروز پور اور امرتسر کا علاقہ جو خود کشیدہ شراب کے لئے مشہور تھا) کی بند بوتل (دوشیزہ)، تجھے مقدر والے ہی پیئیں گے)

؎ تیرے لونگ دا پیا لشکارا
تے ہالیاں نے ہَل ڈک لئے

(اے محبوبہ! تیرے ناک کی کیل کے چمکارے پر کسانوں نے ہَل روک لیے ہیں ــــ یعنی بجلی چمکی ہے، بادل آرہے ہیں اور برکھا ہونے والی ہے)

اڑا دھم، اڑا دھم، اڑا دھم بھنگڑہ
اڑا دھم، اڑا دھم، اڑا دھم بھنگڑہ

آخر رات بیت گئی، مُجرا ختم ہوگیا۔ اب فرشِ زمین پر موتیے کے آزردہ پھول تھے اور ابریشمی ساڑھیوں کے شکستہ بادلے، یا پھر بوجھل پلکوں پر نیند کی دبیز تہیں، جنہیں عالمگیری مسجد کے پُرشکوہ میناروں پر بلالؓ کا وارث جھنجوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

حیّ علی الصّلوٰۃ ــــــــــ حیّ علی الصّلوٰۃ
حیّ علی الفلاح ــــــــــ حیّ علی الفلاح

الصّلوٰۃ خیر من النوم
الصلوٰۃ خیر من النوم

اللہ اکبر ــــــــــ اللہ اکبر

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

اُس بازار میں

رقص آغاز ہے گناہوں کا

اُس بازار میں

آنگن ٹیڑھا

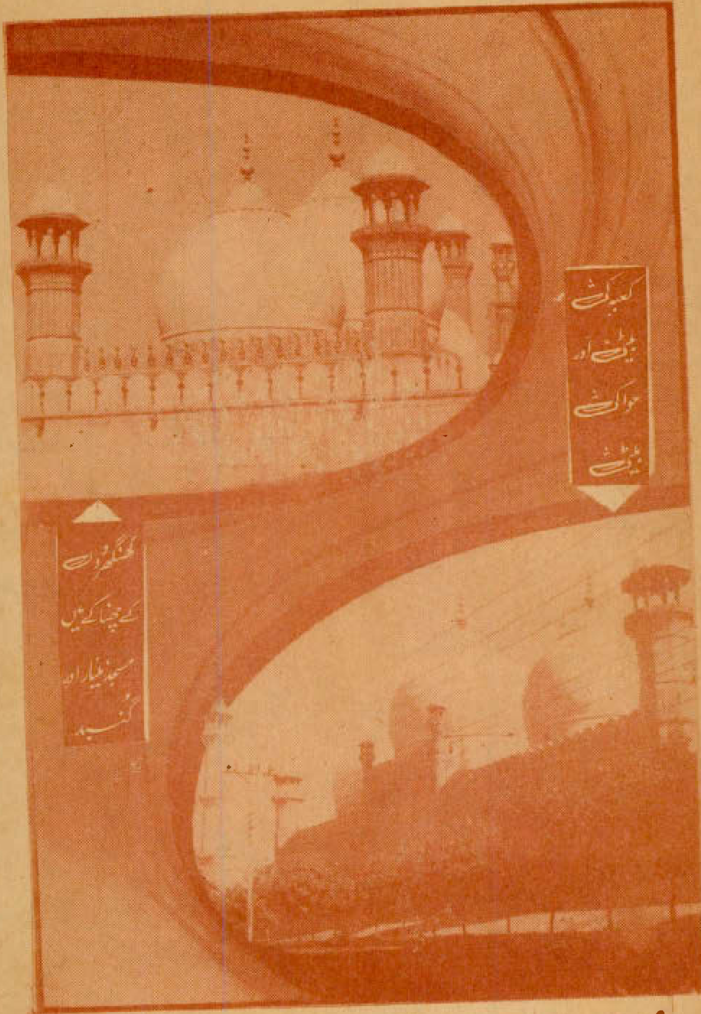

عالمگیری مسجد لاہور

اُس بازار میں

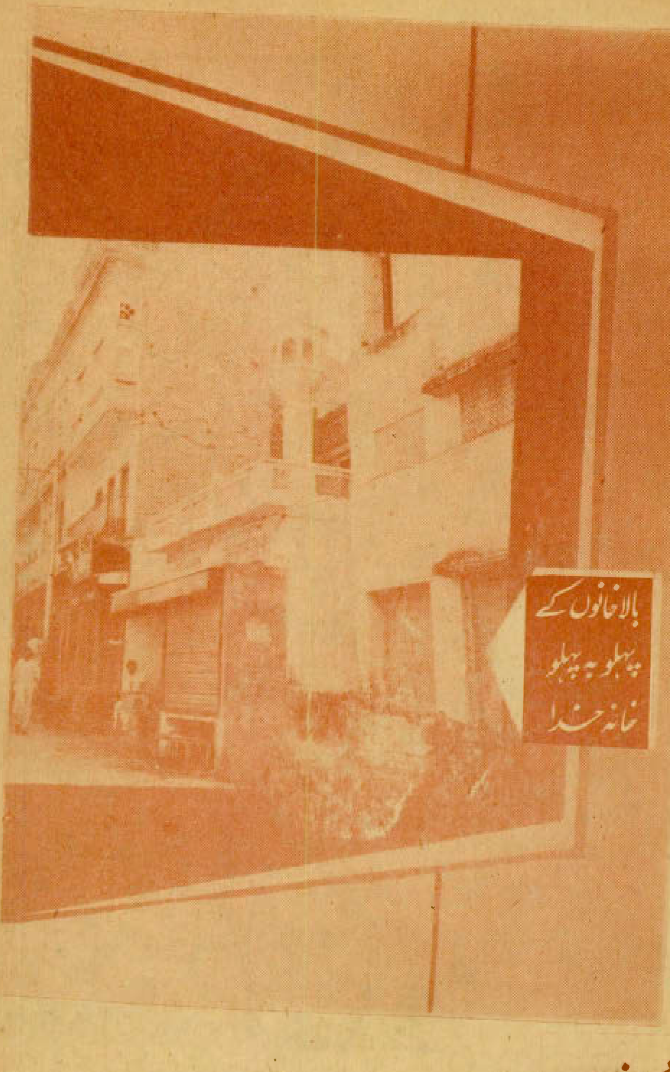

اُس بازار میں

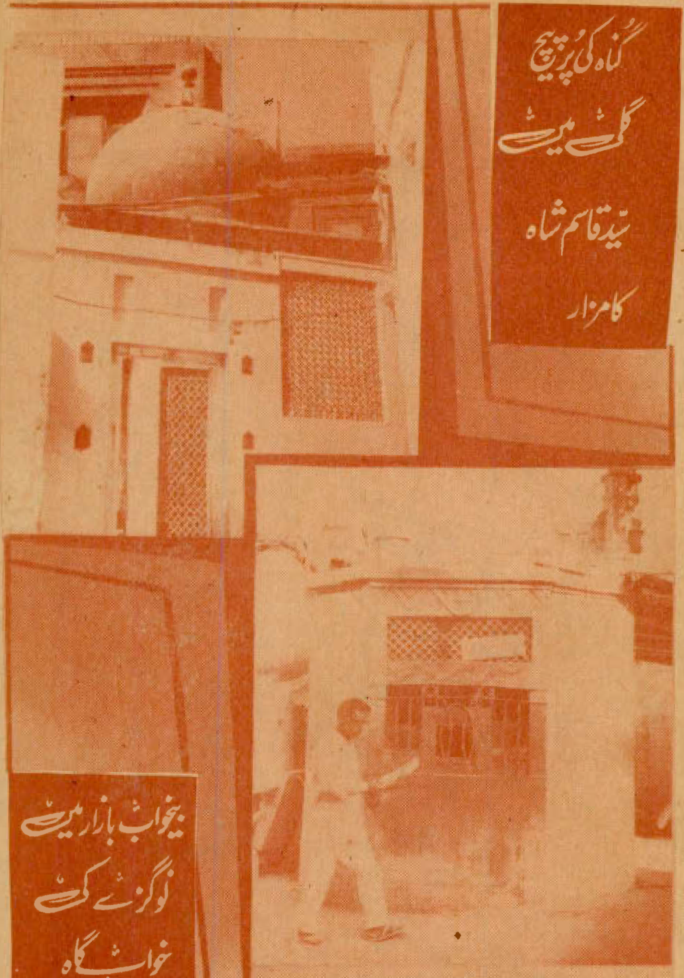
گُناہ کی پُرپیچ
گلی میں
سیّد قاسم شاہ
کا مزار
بیخواب بازار میں
نوگزے کی
خوابگاہ

اُس بازار میں

کھجور کی گٹھلیاں

اُس بازار میں

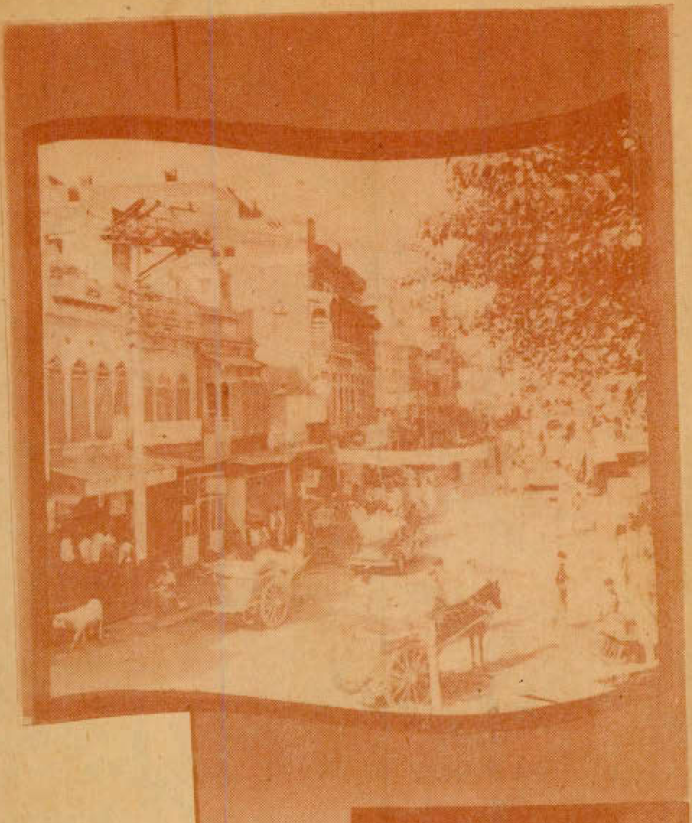

نیلام گھر دلکشی کے

اُس بازار میں

لاہور کا بازار معصیت

اُس بازار میں

سرود منبر و محراب سے خدا کی پناہ

نیلم کی کہانی

اُس بازار میں

اُس بازار میں

فروختنی قہقہہ، عریاں زاویہ

اس بازار میں

ممتاز کی زبانی

اُس بازار میں

مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نَے نوازی

منزل بہ منزل

اُس بازار میں

کاش کے مادر نہ زادے

اُس بازار میں

اُس بازار میں

استحصالِ زر

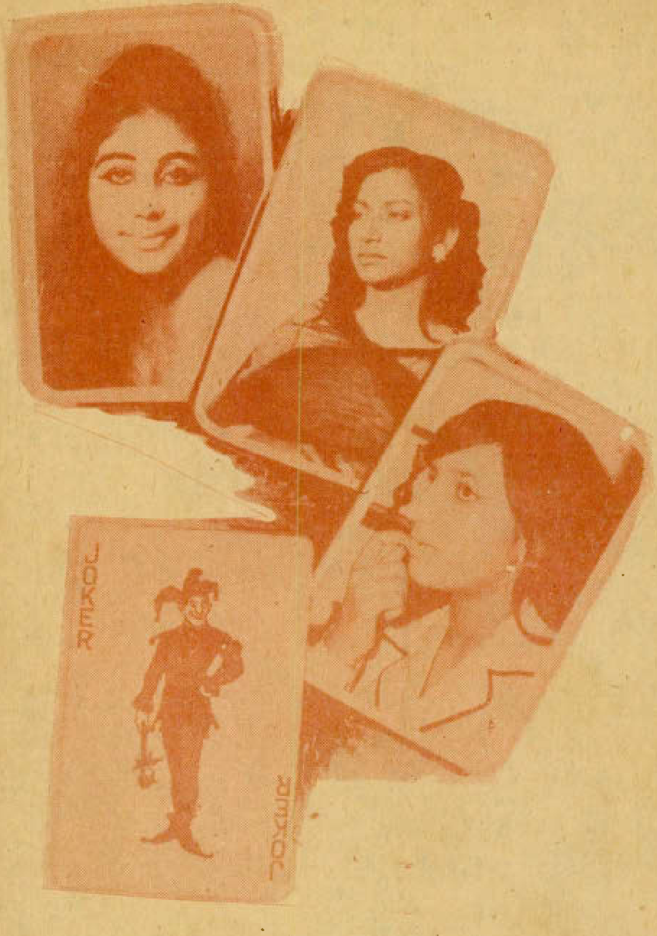

اس بازار میں

تاش کے پتے

— پھر وہ قتل ہو گئی

اس بازار میں

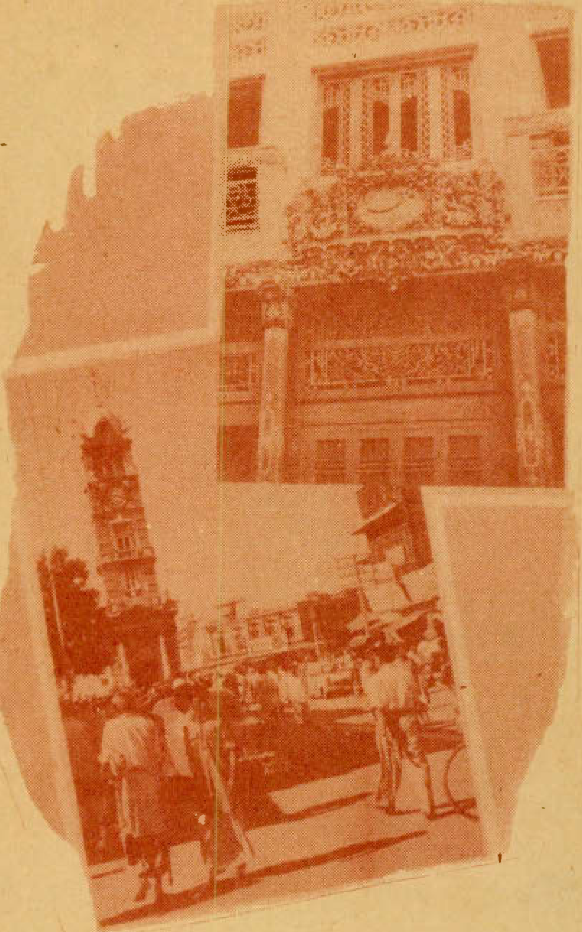

اُس بازار میں

هذا مِن فضلِ ربّي

اُس بازار میں

— یہ سودے پہ تکرار

نیلام گھر کی مصنوعات

اس بازار میں

اُس بازار میں

عورت مر گئی اُترن باقی ہے

عناصر اربعہ کی بھول چوک

اس بازار میں

س بازار میں

عذابِ خدا کو صدا دے رہی ہیں"

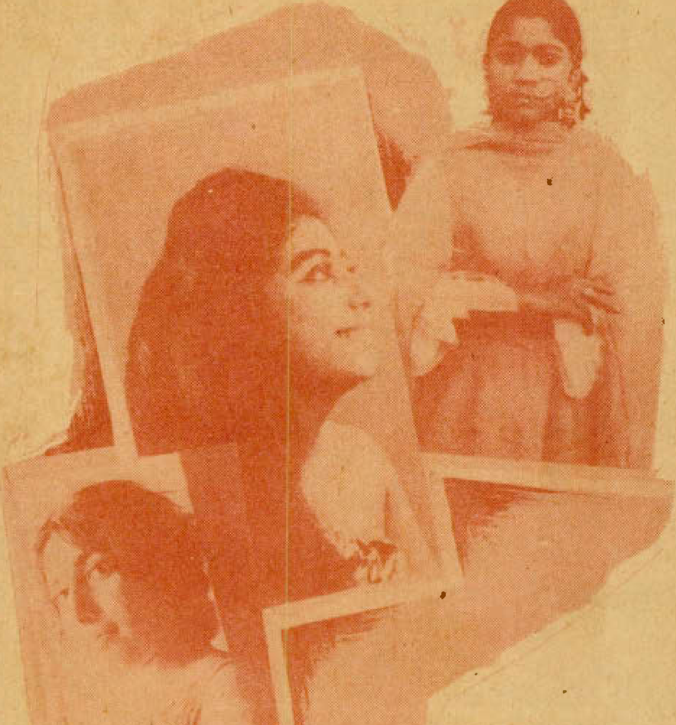

تہذیب کا ارتقار

اُس بازار میں